


فسانہ

اِشاعت کا پہلا سال

شرح چندہ

سالانہ ۸ روپے

ایک کاپی ۷۵ نئے پیسے

فسانہ

رہنما
بلونت سنگھ

مدیر
مسعود احمد

خوشنویس:-
سید احمد حسین

آرٹ

فسانہ میں شائع ہونے والے تمام ادبی یا نیم ادبی مواد میں نام مقام واقعات اور ادارے قطعی فرضی ہوتے ہیں اور حقیقی افراد، مقامات واقعات یا اداروں سے ان کی کوئی مطابقت محض ایک اتفاق ہے جس کے لئے ایڈیٹر، پبلشر یا مصنف پر کوئی ذمہ داری عاید نہیں ہوتی،

طابع و ناشر:- مسعود احمد
مطبوعہ:- اسرار کریمی پریس الہ آباد
ٹائٹل:- بھارگو پریس الہ آباد

دفتر فسانہ ۲۱۶ دائرہ شاہ اجمل الہ آباد

فہرست

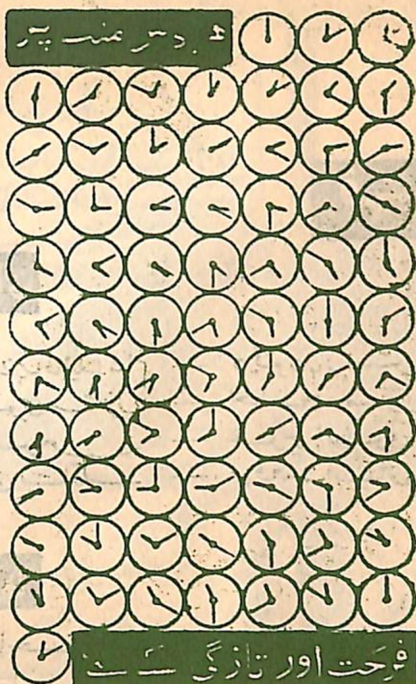
اُردو کہانی

ھندی کہانی

سنگ میل

شکاریات

غیر ملکی کہانی



چیتا فائٹ

بیڑی



پیجئے

حاجی لعل محمد بیڑی ورکس [illegible]


BHARAT



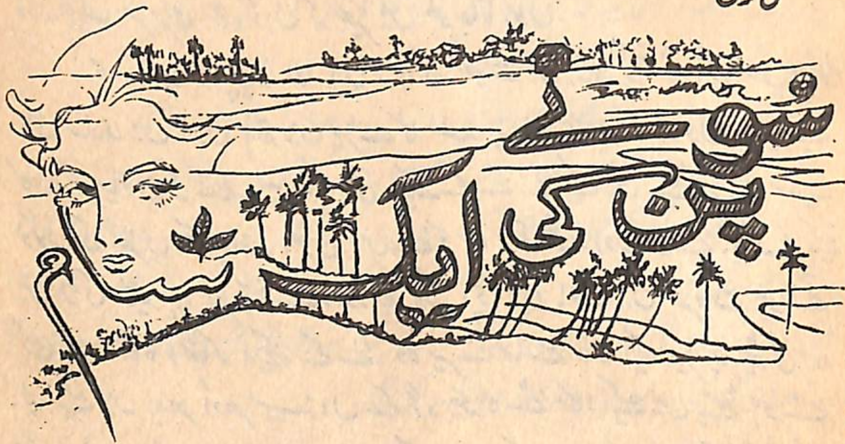
"فسانہ" کا تازہ شمارہ پیش خدمت
ہے۔ خدا کا فضل وکرم ہے کہ ہمیں اچھے
خریداروں کے ساتھ ساتھ عمدہ مصنفین کا
تعاون بھی روز بروز حاصل ہوتا جارہا ہے۔
چنانچہ ہمارا یہ اندازہ بھی غالبًا غلط نہیں
ہے ابتک کہ فسانہ کا ہر شمارہ اپنے سابق
شمارہ سے بہتر اور بڑھ کر ہی سامنے آرہا ہے
اِس شمارہ میں جن ارباب فن کی تخلیقات
ہم پیش کر رہے ہیں وہ سبھی مشہور و
معروف ہیں۔

دیوندر اسر، عزیز اثری، خدیجہ مستور
واجدہ تبسم یہ سب آپ کے جانے پہچانے
ادبی سیارے ہیں ان کی کہانیاں خاص طور
پر آپ کو پسند آئیں گی۔

"مُدیر"



دیویندر اسرّ
10/47 ایسٹ پٹیل نگر
نئی دلی



میں کیفے میں داخل ہوا۔ اور دروازے کے قریب ایک سیٹ پر بیٹھ گیا۔ اس میز سے سامنے سڑک کا سارا منظر نظر آتا تھا۔ کیفے کی دیوار سے لگ کر مڑتے ہوئے لوگ مرد عورتیں اور بچے رنگ برنگ لباس میں نئی تراش خراش کے کپڑوں میں، ہر طرح کے بناؤ سنگار کئے کچھ پرانے، کچھ نئے طرز کے لوگ، مختلف چہرے مختلف شکلیں، مختلف خد و خال کام کاج سے واپس لوٹتے ہوئے لوگ، سیر تفریح کرتے ہوئے لوگ، خوش گپیاں کرتے ہوئے لوگ۔ انتظار کرتے ہوئے۔ بے کار کھڑے ہوئے لوگ، موٹریں، بسیں، سائیکلیں، رکشا اور پیدل چلتے ہوئے لوگ .... لوگوں کی بھیڑ بے ترتیبی سے حرکت میں تھی۔ اس بھیڑ میں میری نظر ایک چہرے پر اچانک رک گئی۔ یا یوں کہئے کہ کیفے کے دروازے پر اسکے ایک لمحہ ٹھٹک کر رُکنے کے ساتھ ہی میری نظر بھیڑ سے ہٹ کر اس پر ٹھہر گئی۔ کیفے کی دیوار سے لگ کر مڑتے ہوئے میں نے اسے دیکھا تھا۔ کیفے کے دروازے پر وہ رکی اور پھر چپکے سے کیفے میں داخل ہوگئی۔ اس کے ساتھ ایک چھوٹا بچہ تھا۔ لال شرٹ اور ہلکے نیلے رنگ کی جین پہنے ہوئے۔ اس کی پیشانی پر سیدھے کٹے ہوئے بال اڑ رہے تھے۔ نامعلوم کیوں جب میں کسی لڑکی یا عورت کے ساتھ کسی بچے کو

دیکھتا ہوں تو میری نگاہ پہلے بچے کا جائزہ لیتی ہے۔ اس کا لباس، اس کا چہرہ اسکی پیشانی۔ اسکے بال۔ اسکی آنکھیں، اسکا تجسس، اسکی شرارتیں، اسکی حرکتیں۔ اگر ان میں مجھے کچھ جاذبیت، کچھ غیر معمولی کشش نظر آئے تو پھر لڑکی کی جانب دیکھتا ہوں ورنہ ایک سرسری نگاہ ڈال کر بھیڑ میں کھو جاتا ہوں۔

بچہ واقعی بڑا پیارا تھا۔ اس لڑکی کی شخصیت بھی بڑی پر کشش تھی۔ سفید پھولوں والی ساری میں ملبوس ہاتھ میں چمڑے کا سفید پرس لئے۔ اسکے قدموں کی چاپ کافی کے پیالوں کی کھنک میں گم ہوگئی۔ ایک لمحے کے لئے کیفے میں بیٹھے ہوئے سب لوگوں کی نظریں اسکی جانب اٹھیں۔ اس لئے کہ وہ لڑکی تھی۔ اور اس لئے بھی کہ اس کیفے میں لڑکی شاید ہی نظر آتی ہے۔ اور پھر لوگ اپنی اپنی باتوں میں مصروف ہو گئے کبھی کبھی نگاہ اٹھا کر دیکھنے کے لئے۔ وہ میرے سامنے والی ایک میز پر بیٹھ گئی اور بچہ کیفے میں اِدھر اُدھر میزوں کے گرد چکر کاٹنے لگا۔ کیفے میں بیٹھے ہوئے لوگ پیار سے اُس سے مذاق کرتے۔ لڑکی نے دو ایک بار بچے کو بلانے کی کوشش کی۔ لیکن شاید کسی منظر کے پیدا ہونے کے ڈر سے بچے کو آزاد ہی چھوڑ دیا۔ اس نے دونوں ہتھیلیوں میں چہرہ دبا کر کہنیوں کو میز پر ٹکا دیا۔ بیرے کو شاید اس نے اپنے لئے صرف کافی کا آرڈر دیا اور بچے کے لئے پائن ایپل پیسٹری کا۔ وہ میز پر لگے شیشے میں اپنے چہرے کا عکس دیکھنے لگا۔ اور نہ معلوم کیوں جیسے ایک دم اداس ہوگئی۔ اس نے اپنی پیشانی پر بکھرے ہوئے بالوں کو سنوارا۔ ان بکھرے ہوئے بالوں سے اس کی شخصیت کے لاابالی پن کی کچھ جھلک ملتی تھی۔ شاید شیشے میں اپنا عکس دیکھ کر اسے یہی خیال آیا ہوگا۔ اور اسے چھپانے کے لئے ہی شاید وہ میز پر ایک ٹک دیکھ رہی تھی۔

کافی آنے پر اس نے اپنا سر اٹھایا۔ اپنے اردگرد بیٹھے ہوئے لوگوں کو دیکھا۔ اسکی آنکھیں بچے کی تلاش میں کیفے میں چاروں طرف گھومیں۔ وہ کرسی سے اٹھی۔ میں نے محسوس کیا کہ اسے اتنی ساری میزوں اور ڈھیر ساری نگاہوں میں سے گزر کر بچے کو پکڑ لانا کچھ عجیب سا یا دشوار نظر آرہا تھا۔ میں نے اسکے چہرے کو غور سے دیکھنے کی کوشش کی مجھے یہ چہرہ کچھ مانوس سا نظر آیا۔ یا شاید تھوڑی دیر تک آپ کسی چہرہ کو بھی دیکھیں تو

وہ مانوس سا نظر آنے لگتا ہے۔ اس ذہنی افراتفری میں اسکی نگاہ مجھ پر پڑ گئی۔ میں جیسے پکڑ گیا۔ میں اپنی کرسی سے اٹھا اور بچے کی طرف لپکا۔ بچہ کاؤنٹر کے پاس پڑے فش پانڈ کو دیکھ رہا تھا۔ میں اسے پچکار کر لے آیا۔ جب میں بچے کو لا رہا تھا تو اس نے شکر گذار آنکھوں سے میری طرف دیکھا۔ لیکن میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ میں اس سے کیا کہوں۔ یعنی بچے کا اُس سے کیا رشتہ ہے۔ لیکن میں نے یہی کہا۔

"کتنا سویٹ" اگر مجھے یقین ہوتا کہ یہ اسکا بچہ ہے تو میں یقیناً یہی کہتا۔

"آپ کا بچہ بڑا نٹکھٹ ہے۔ اس نے بچے کو اپنے پاس کرسی پر بٹھاتے ہوئے کہا۔

"اور مجھ اکیلے کو ہی اسکی شرارتیں برداشت کرنی پڑتی ہیں۔ اس نے بچے کے گال پر چٹکی کاٹتے ہوئے کہا۔ بچہ پیسٹری کھانے میں مشغول تھا اسکے منہ پر لگی ہوئی کریم بڑی بھلی معلوم ہوتی تھی۔ اس عورت نے (جواب میرے لئے لڑکی نہیں تھی) رومال سے اسکا منہ صاف کرنا چاہا۔ میرے منہ سے اچانک نکل گیا۔

"پلیز ڈونٹ"۔

وہ رک گئی۔

اس نے میری طرف دیکھا۔ ایک چہرہ ہراس بھرا۔ بالکل اجنبی چہرہ۔ ایک ایسا رنگ جس کا کوئی نام نہیں۔ ایک ایسی کیفیت جس کا مجھے پہلے کبھی احساس نہیں ہوا تھا۔ آخران دو لفظوں میں کیا تھا کہ اس کا چہرہ ایک دم بدل گیا۔ اور میں کچھ پوچھنے کی جرأت نہ کر سکا لیکن اتنا ضرور جانتا ہوں کہ اِن دو لفظوں میں کچھ ایسی بات ضرور تھی کہ میرے اور اس کے درمیان اجنبیت کی دیوار مٹ گئی۔ اس نے مجھے بیٹھنے کے لئے کہا۔ میں اسکے سامنے کرسی پر بیٹھ گیا

"آپ کافی پئیں گے یا چائے؟" اس نے پوچھا

"کچھ بھی نہیں۔ ابھی ابھی کافی پی رہا تھا۔"

لیکن آپ نے پوری تو پی نہیں ہوگی۔ اس بچے کی خاطر۔"

"بچوں کی خاطر زندگی میں کئی چیزیں ادھوری چھوڑنی پڑ جاتی ہیں۔ میں نے بغیر کسی فلسفیانہ معنی کے کہا۔

"اور شاید کئی باتیں پوری بھی ہو جاتی ہیں۔" اس نے کہا۔

"مجھے کوئی خبر نہیں۔ میں نے کہا

"کیوں۔ کیا آپ ... میرا مطلب ہے۔" اس نے پوچھا۔

"جی ہاں۔ میرا کوئی بچہ نہیں اور نہ ہی میری شادی ہوئی ہے۔ میں نے سب سوالوں کا جواب دے دیا۔

"اوہ! تب ہی آپ فلاسفر بننے کی کوشش کر رہے ہیں۔" وہ مسکرائی۔

بچے نے میری طرف دیکھا اور میری جیب سے پین نکال لیا۔

"ڈونٹ بی سلی۔" ماں نے کہا۔ میں نے کوئی مدافعت نہیں کی۔ بچے نے پیسٹری کھانا چھوڑ دیا تھا۔ اور وہ فش پانڈ کی طرف بھاگ گیا تھا۔ ماں نے روک کر زبردستی اس کا منہ صاف کرنے کی کوشش کی۔ لیکن وہ بازو چھڑا کر آستین سے منہ صاف کرتا ہوا دور نکل گیا۔

"بہت تنگ کرنے لگا ہے۔" اس نے کہا۔ لیکن شاید اس نے یہ شکایت کسی سے نہیں کی تھی۔ محض ایک حقیقت کا بیان تھا۔ جس میں شکایت سے زیادہ پیار کی لاچاری تھی۔

اس نے بیرے کو بلا کر بل منگایا۔ میں نے جیب سے پرس نکالا اور بل ادا کرنے لگا۔

لیکن اس نے مجھے بل ادا نہیں کرنے دیا۔ بیرے کو پیسے دیتے ہوئے اس نے کہا۔

"آتی بار اس بچے کو بھی پکڑتے لانا۔"

اس دوران میں اس سے کوئی بات نہیں ہوئی۔ بیرا باقی پیسے واپس کرنے آیا۔ وہ بچے کو بھی ساتھ لے آیا تھا۔ وہ اٹھی اور باہر جانے لگی۔ میں بھی اسکے ساتھ کیفے سے باہر نکل آیا۔

"اگر آپ برا نہ مانیں تو ایک بات کہوں۔" میں نے کہا۔

"کیا۔"

"اس بچے کو بوتل میں بند ننھی ننھی مچھلیاں خرید کر دینا چاہتا ہوں۔ کیوں ننھی مچھلیوں سے کھیلو گے نا۔"

"یس انکل۔" ماں کے انکار کرنے کی کوئی گنجائش نہ تھی۔

میں نے بچے کو گود میں اٹھایا۔ سڑک پار کر کے کناٹ پلیس کے برآمدوں میں داخل ہو گیا۔ مجھے ایک غیر معمولی مسرت کا احساس ہو رہا تھا۔ جیسے میں خود ایک ننھا سا بچہ ہوں اور

میرے ہاتھ میں ایک بڑا خوشنما غبارہ ہے۔ اُن کے ساتھ چلنے میں مجھے ایک ایسے بھرے پورے ہونے کا احساس ہوا، جو میں نے زندگی میں پہلے کبھی بھی محسوس نہیں کیا تھا۔ تنہائی، اکیلاپن اداسی اور اجنبیت کے اندھیرے میں میری زندگی سے بھٹک رہی تھی۔ میں اسکا نام نہیں جانتا۔ اسکے خاندان کے بارے میں نہیں جانتا تھا۔ اُسکے بارے میں کچھ بھی نہیں جانتا تھا۔ سوائے اسکے کہ وہ ماں بیٹے ہیں۔ لیکن جیسے وہ میری زندگی کے ایسے ہیں جن کے بغیر میری زندگی کا کوئی وجود نہیں۔ کوئی جواز نہیں۔ کوئی معنی نہیں۔

میں بچے سے ایسی باتیں کر رہا تھا جنکا کوئی مطلب نہیں تھا۔ میں اسکا نام پوچھا اس کا نام راجیش تھا۔ وہ شوکیش میں لگی ہوئی چمچماتی چیزوں کو دیکھ کر بڑا خوش ہو رہا تھا۔ شوکیس کے شیشوں پر اسکی ننھی ننھی انگلیوں کے نشان سے پڑ رہے تھے۔ وہ کبھی کسی دکان میں گھس جاتا۔ کبھی شوکیس کے باہر رک جاتا۔ کبھی بھیڑ میں گم ہو جاتا۔ اور ایک جگہ اچانک وہ رک گیا۔

"انکل انکل مچھلیاں"

اور جب میں نے بوتل میں بند شفاف پانی میں تیرتی ہوئی ننھی ننھی رنگ برنگی مچھلیاں خرید کر اسے دیں تو وہ بہت خوش ہوا۔ اور پھر جیسے میں بھول گیا کہ میرا بھی کوئی وجود ہو۔ اسکے لئے جیسے ساری دنیا اس شیشے کی بوتل میں سمٹ آئی ہو۔

میں کچھ تھک گیا تھا اور شاید وہ بھی۔ ہم تھوڑی دیر کے لئے پارک میں بیٹھ گئے۔ ہری ہری گھاس پر وہ انگلیوں سے جیسے کچھ لکھنے لگی۔ اور راجیش مچھلیوں سے کھیل رہا تھا۔ شام کے سائے دھیرے دھیرے بڑھ رہے تھے۔ سورج بڑی بڑی عمارتوں کے پیچھے ڈوب رہا تھا۔ اور عمارتوں کے سائے پارک میں پھیل رہے تھے اور پھر ایکدم جیسے روشنی کی آخری لکیر بھی مٹ گئی۔ اندھیرا اور لالی ایک دوسرے میں پیوست ہو گئے۔

وہ ایک دم چونکی۔

"کیا بات ہے۔" میں نے گھبرا کر پوچھا۔

اس نے میری دیکھا۔ اور ہتھیلیوں میں منہ چھپا لیا۔

ایسا ہی وقت رہا ہوگا۔ دونوں پھر ملنے کا۔ جب اندھیرا دبے پاؤں انکے پیچھے آرہا ہوگا۔ اور پھر وہ اکیلے دشمنوں کے نرغے میں گھر گئے ہوں گے اور پھر یہ اندھیرا کتنا گہرا

ہوگا۔ کتنا دھواں ہوگا؟ اوہ میرے ایشور ــــ میں اس لمحے سے کتنا بھاگتی ہوں۔ لیکن یہ ہر روز مجھے ڈستے آجاتا ہے۔"

وہ ایکدم اٹھ بیٹھی۔ اور اس نے بچے کو آواز دی۔

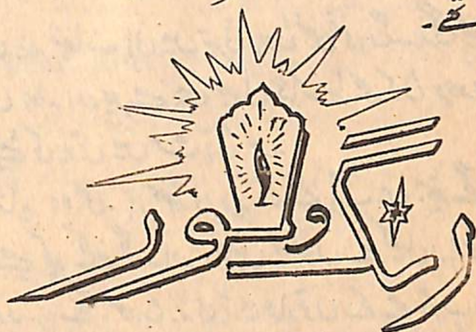
چلو بیٹے گھر چلیں ــ آپ کا بہت بہت شکریہ۔ آپ کے ساتھ بہت خوش رہا۔"

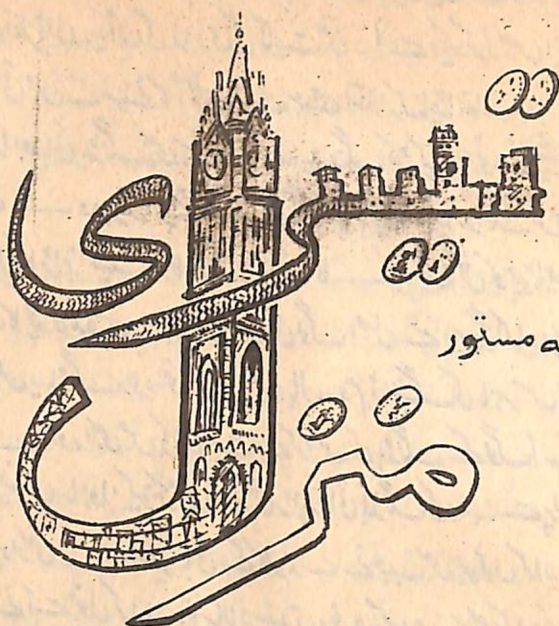
وہ کہہ رہی تھی۔ اور پھر تیز تیز قدموں سے سڑک پر چلی گئی۔ دُور سے بچے کی آواز آرہی تھی۔

" انکل ہمارے گھر ضرور آنا۔ جب ڈیڈی آئیں گے تو میں انھیں بتاؤں گا۔ انکل میرے بڑے اچھے دوست ہیں۔ انہوں نے مجھے ڈھیر ساری رنگ برنگی مچھلیاں خرید کر دی ہیں۔"

اور پھر یہ آواز بھی مٹ گئی۔

سڑک پر لوگوں کی بھیڑ بدستور جاری تھی۔ اور وہ سڑک پار کرکے دور نکل جا چکے تھے۔





حلیمہ بائی بلڈنگ کی چوتھی منزل کے خوبصورت فلیٹ میں بیٹھے بیٹھے حلیمہ بائی کو ایک دم غصّہ آگیا۔ اُنھوں نے وفد کے لیڈر دلّی والے کی فصیح و بلیغ شکایات سُننے کے بعد سر ہلا کر کہا: ——

"ہن ہم کسی کے بولنے کا کس طرح ایک دم مان لے گا —— فیر دیکھو، بابا کوئی گھر کو کچھ بولیں گا تو ہم پہلے اس کا تپاس کریں گا فیر (پھر)"

دلّی والے ایک دم گرم ہوگئے۔

"پھر آپ اُسے نہیں نکالیں گی تو ہم پولیس کو اطلاع دیں گے —— یہ بھی کوئی بات ہے کہ شریفوں کے رہنے کی جگہ پہ ——"

"اوبابا گرم کیوں ہوئیں گا وہ ہمارا سگے والا نہیں لگتا۔ ہم بولا پہلے تپاس کریں گا۔"

یہ کہہ کر حلیمہ بائی نے اپنے کارندے کو بلایا اور اُسے بظاہر سخت آواز میں تحقیق کرنے کا حکم دے دیا —— اس کے بعد دلّی والے کی قیادت میں وفد والے حلیمہ بائی بلڈنگ سے اُتر گئے۔

حلیمہ بائی نے زور سے دروازہ بند کر کے کھڑکی میں سے رابعہ بائی بلڈنگ پر ایک گہری نظر ڈالی۔ یہ اُن کی دادی کی ملکیت تھی۔ اسے دیکھ کر اُنھیں اپنی بوڑھی زرد رُو دادی یاد آئی جس کے مرنے کا اُنھیں بہت عرصے انتظار کرنا پڑا تھا۔

رابعہ بائی بلڈنگ بھی میلی زرد تھی۔ بد رنگ کھڑکیاں، ٹوٹے شیشے اور ہلتے ہوئے چوبی زینے —— وہ ہمیشہ اپنے کارندے سے کہا کرتیں: "یہ بلڈنگ گرے گا تو ہم اس جگہ آٹھ منزل کا بڑا بڑا فلیٹ والا بلڈنگ بنائیں گا —— آج کل کو چھوٹا چھوٹا کمرہ کرائے پر اُٹھانے کا کچھ فائدہ نہیں۔ بڑا ہو تو امیر لوگ اصل سے دس گنا کرایہ دیں گے۔"

لیکن یہ بلڈنگ موجود تھی۔ اس میں بال روم ڈانسنگ کی ماہر مس ڈورتھی پریرا رہتی تھی —— اور ابھی جس کی شکایت لے کر اس کی بلڈنگ کے لوگ آئے تھے ——

حلیمہ بائی کو افسوس سا ہوا، کیونکہ مس ڈورتھی رابعہ بائی بلڈنگ کی سب سے پرانی لیکن سب سے بہتر کرایہ دار تھی —— حلیمہ بائی کے کارندے نے جب بھی جھوٹوں کرایہ بڑھانے کو کہا، ڈورتھی نے اُسے قبول کر لیا۔ وہ سالانہ سفیدی وغیرہ کے روپے بھی کرائے میں نہ کاٹتی۔

"اکیلی ہے مگر اس کے گھر کبھی کوئی دنگا بھی نہیں ہوا۔" حلیمہ بائی اپنے جی میں کہہ رہی تھیں ان کی آنکھیں بار بار مس ڈورتھی کے کمروں پر اُٹھتیں، جن کی پیشانی پر اس نے نیلا پینٹ کرا رکھا تھا۔ جس کی کھڑکیوں اور دروازوں کے سارے شیشے سلامت اور صاف تھے۔

مگر یہ گندگی کا قضیہ نہیں تھا —— اگر ایسا سوال اُٹھتا تو ٹی والے کے کمرے کے سامنے کوریڈور میں سب سے زیادہ گندگی کی پوٹ تھی —— گراؤنڈ فلور پر "فینسی شو میکرز" کے یہاں سے پھینکی ہوئی چمڑے کی کترنیں فٹ پاتھ پر بکھری رہتیں، دوسری منزل کی بوہرہ خاتون جھینگا مچھلی کی ٹانگیں اور مونچھیں نوچ کر ہمیشہ زینے پر پھینک آتیں۔ اور ان کے پڑوس کے کمرے میں رہنے والے مسٹر ڈگلس وائلن کی مشق کرتے کرتے کھانستے تو ہمیشہ دوڑ کر بوہرہ خاتون کے دروازے پر تھوکتے —— پھر تو شاید تیسری منزل کی بھولی بھالی میمن زینب بائی بھی اس چکر میں آجاتی جو ایک اچھی پڑوسن تھی، لیکن اپنے بچے کا پاخانہ کاغذ میں لپیٹ کر ڈورتھی کے گھر کے سامنے پڑے ہوئے کوڑے کے ڈبے میں

رضیہ بیگم منطق چھانٹتیں اور زینب بائی جھلا کر چپ ہو جاتیں۔

اب اس بات پہ کیا بحثنا، یہ تو ساری بلڈنگ والے جانتے تھے کہ مس ڈورتھی کے گھر جہاں کبھی کوئی مرد آیا تو کمرے کا دروازہ پاٹوں پاٹ کھلا نظر آنے لگا ــــ دروازہ بند ہو تو سمجھو ڈورتھی گھر میں اکیلی ہے۔ اور جب وہ گھر میں اکیلی ہوتی تو اس کی پڑوسنوں کو خبر ہوتی کہ وہ یا تو سو رہی ہوگی یا ناچ کی مشق کر رہی ہوگی۔

رابعہ بائی بلڈنگ میں آنے کے بعد شروع شروع میں مس ڈورتھی ناچ والی بات کو یہاں کے رہنے والوں سے چھپاتی مگر جب اس کے ڈرائینگ روم کی چھت تلے رہنے والی بوہرہ عورت نے اوپر کی بے تحاشہ کھٹ کھٹ کی شکایت کرنی شروع کی تو مس ڈورتھی نے صاف کہہ دیا کہ ناچ اس کی زندگی ہے۔ وہ ناچے گی اور ضرور ناچے گی۔ نہیں ناچے گی تو زندہ کیسے رہے گی ــــ؟

جب جھگڑا بڑھا تو بوہرہ عورت کے پڑوسی مسٹر ڈگلس وائلن والے نے اپنا کمرہ بدل لیا۔ اس لئے اب مس ڈورتھی اوپر ناچتی تو نیچے مسٹر ڈگلسن اپنے وائلن پر ناچ کے مطابق دُھن بجایا کرتا۔ بڈھا ڈگلسن جس کے سفید کوٹ پہ ہر دوسرے تیسرے مہینے کالے رنگ کی ماتمی چیٹ سلی ہوئی ہوتی ــــ اور جو کام کی تلاش میں عموماً بیکار رہتا تھا۔ مگر مس ڈورتھی ڈگلسن سے بھی کوئی واسطہ سوائے "ہلو" کے نہ رکھتی۔ ہاں سال میں ایک بار کرسمس کے موقعے پر وہ اُسے ضرور اپنے یہاں لنچ پر بلاتی۔ یہ اور بات ہے کہ دوسری منزل پر رہنے والے نوجوان بابو نے ڈورتھی کے ملازم چھوکرے کے ہاتھ سے چٹیں لے کر کئی بار پڑھیں جس میں ڈگلسن کو مخاطب کر کے لکھا ہوتا کہ "فلاں ہوٹل میں یا فلاں فلم کمپنی میں وائلن بجانے والے کی ضرورت ہے۔ فوراً پہنچو۔ شاید کام بن جائے"۔

ان چٹوں کی وجہ سے بہاری نوجوان بابو ــــ ڈورتھی کو ہمیشہ مشکوک نظروں سے دیکھتا۔ اور راتوں کو ڈگلس کے دروازے پر کان لگائے رکھتا کہ اب بڈھا چپکے سے تیسری منزل پر جانے کے لئے نکلے گا۔ لیکن جب دوسرے دن وہ دفتر جانے کے خیال سے جلدی سے ہڑبڑا کر اُٹھتا تو بڈھے ڈگلسن کا دروازہ بند پا کر اس کا کلیجہ مسلنے لگتا ــــ دیکھا ابھی تک ہو رہا ہے، رات جاگا ہوگا۔

اسی چکر میں ایک رات یہ بابو صاحب ڈورتھی کے کمرے میں جا پہنچے ــــ رات کے

چپکے سے ڈال دیا کرتی تھی۔

"فوہ، لوگ کا دماغ پھر گیا ہے اپنا کام نہیں کرتا —" حلیمہ بائی نے رابعہ بائی بلڈنگ کا رُخ پر کھلنے والی کھڑکی کا پردہ گھسیٹ دیا اور بیٹھ کر اپنے سیاہ دوپٹے پر فیتہ ٹانکنے لگیں۔

حلیمہ بائی کا کہنا ٹھیک تھا کہ لوگ اپنے کام سے کام رکھیں۔ مگر رابعہ بائی بلڈنگ کے مکینوں میں سوائے مس ڈورتھی پریرا کے کوئی ایسا نہ تھا جسے صرف اپنے آپ سے مطلب ہو۔ یہاں مختلف جگہوں سے آئے ہوئے لوگ رہتے تھے۔ اس لئے ہر شخص خود کو بھول کر دوسرے کو کھوجنے کی فکر میں رہتا — لیکن مس ڈورتھی پریرا اپنے آپ میں اتنی مست رہتی کہ لوگوں کے لئے پر اسرار حد تک دلکش بن گئی — مرد اس پر عاشق تھے اور عورتیں حاسد۔ بلڈنگ کی سب عورتیں ڈورتھی کی چال ڈھال اور لباس کی نقل کرتیں۔

وہ عموماً دن بھر اپنے گھر میں رہتی۔ ٹیلکم پوڈر میں بسی بڑے بڑے پھولوں والے پرانے جاپانی کمونو میں ملبوس لکڑی کی جاپانی کھڑاؤں پر وہ یوں چلتی جیسے سمندری لہروں پر کوئی ننھا سا بادبانی ڈونگا — جانے یہ جاپانی کھڑاؤں کے تلے کی تراش کی وجہ سے تھا یا کیا۔ بہر حال یہ چال غیر معمولی تھی۔ جسے اس کے پڑوس کے دلّی والے کی جوان ہوتی ہوئی بیٹی بہت غور سے دیکھتی اور اپنی ماں رضیہ بیگم کو یہ کہنے پر مجبور کر دیتی کہ "اے بی اس کا مٹکنا کیا آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھ رہی ہو — اس سے تو پردہ جائز ہے۔" مگر مس ڈورتھی کو کسی پردے وردے کا خاک خیال آتا — وہ صبح سبح اُٹھ کر کوریڈور سے اپنے ملازم چھوکرے کو اُٹھاتی اور پھر نہ صرف اپنے فلیٹ کی صفائی آپ کرتی بلکہ اپنے سامنے چھوکرے سے کوریڈور کی بھی خبر لوا ڈالتی۔ اس بلڈنگ کی بھنگن تو ایسی کام چور تھی کہ فلش بھی ٹھیک طرح دھو کر نہ جاتی تھی۔ کوریڈور کی صفائی۔ رضیہ بیگم اس صفائی پر بُرا مانتیں، کیونکہ انھیں یقین تھا کہ یہ سب اپنے یاروں کی وجہ سے ہوتا ہے۔

حالانکہ ڈورتھی کی دوسری پڑوسن میمن زینب بائی کا کہنا تھا کہ اگر مس ڈورتھی کے یہاں آنے والے اُس کے یار ہوتے تو کبھی رات کو تو رکتے —؟

"دن کو جو آتے ہیں؟ اے بی یہ بھی کوئی ہو بیٹی ہے کہ رات کے اندھیرے میں میاں کی صورت دیکھے نائیں تو حرام سمجھے۔"

"اُدھر بمبئی میں ہمارا کتنا کام تھا۔ اُدھر ہم بال روم ڈانسنگ سیکھا۔ ڈانسنگ اسکول کا مالک ہم کو دوسرا چھوکرا لوگ کا پارٹنر بننے کا کتنا بہت روپیہ روز کا دیتا تھا۔ پہ ہم کو روپیہ کا تو ڑ نا نہیں ہم کو ناچ کا شوق تھا۔ ادھر سب ہم کو بولتا تم لوریٹا ینگ کی موافق ہے، تم کو فلم میں کام کرنا مانگتا۔ مگر ادھر کا فلم والا ہمارا بیوٹی کو نہیں سمجھا۔ فیر ہم کو لوگ بولا تم ہالی وڈ جانا مانگتا۔ پن ہمارے کو اتنا کرایہ نہیں جڑا۔ فیر ادھر بمبئی میں ایک اسسٹنٹ ڈائرکٹر تھا، بڑا حرامی سب کا قرض کھا گیا۔ ہم سے بھی قرض لیا، ہم مانگا تو بولا ہمارے سنگ پاکستان چلیں گا تو اُدھر کام دیں گا۔ اُدھر ڈائرکٹر بھی مانگتا اور ہیروین بھی۔ فیر دیپر ہم اُدھر کراچی آگیا۔ ادھر کا فلم والا بھی ہماری بیوٹی کو نہیں سمجھا۔ تم لوریٹا ینگ کو دیکھا ہے، بائی دی گارڈن آف اللہ، والی؟"

وہ اپنی داستان کہتے کہتے زینب سے پوچھنے لگی۔ مگر زینب بائی نے کبھی کوئی انگریزی فلم نہیں دیکھی تھی۔ وہ مایوس ہوگئی، وہ اکثر مایوس ہو جایا کرتی تھی۔

"ادھر کا چھوکرا لوگ بھی لوریٹا ینگ کو نہیں دیکھا۔" اس نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا تھا۔ اور پھر اپنے سنہرے بالوں میں سے پنیں کھول دیں۔ ایک دم اس کے سانولے چہرے کے گرد سنہرے ریشمی بال دھوپ میں گرتے ہوئے آبشار کی طرح پھیل گئے۔

مگر مسٹر ڈگلس نے لوریٹا ینگ کی فلمیں دیکھیں تھیں اور بمبئی میں ڈورتھی پریرا کو بھی دیکھا تھا نمبر ون پالولر ڈانسر تھی۔ اس کی ماں سیٹھ کے بچوں کو رکھتی اور یہ اسکول میں پڑھتی۔ پھر ایک دن اس کی ماں سیٹھ کے مکان میں بہت چیخی کہ سیٹھ نے میری بچی کو اپنے کمرے میں رکھ لیا ہے۔ میں نے اس کی ماں کو بہت سمجھایا۔ چپ رہو۔ پھر وہ چپ ہوگئی۔ اور ڈورتھی ہوا سے باتیں کرنے لگی۔ میں ان دنوں سیٹھ کے ایک بیٹے کو وائلن سکھاتا تھا۔ چھوٹی سی گڑیا سی لڑکی تھی۔ اب انکل سے بولتی بھی نہیں پرچے لکھتی ہے۔" مسٹر ڈگلس اپنے مرجانے والے عزیزوں کی تصویروں کے درمیان بیٹھا ڈورتھی کے ہاتھ سے لکھے ہوئے پرزوں کو دیکھ کر تنہائی میں بڑبڑایا کرتا۔ اس کی ایک بیٹی لکھنؤ میں تھی اور اس نے کسی سکھ سے شادی کر لی تھی۔

"میں اگر لکھنؤ میں ہوتا تو ایسا ہو سکتا تھا!" مسٹر ڈگلس فینسی شومیکرز کے مالک حنیف سے بات کرتے ہوئے کہا کرتا۔ "انسان کو اپنے مذہب میں ہی شادی کرنا چاہئے۔"

سناٹے میں ان کے ہولے سے کھٹکھٹانے پر ایک دم دروازہ کھلا اور پھر ڈورتھی نے زور زور سے بولنا شروع کر دیا۔

"ہم تمہارے کو پولیس میں دیں گا..... بولو تم ہم کو کیا سمجھا —" ڈورتھی کے ہاتھ میں بابو کی ٹائی تھی۔ بڑی مشکل سے دلّی والے اور میمن دوکاندار نے اس کو چھڑوایا تھا۔

دلّی والی رضیہ خانم نے اس قصے کے بعد سینہ ٹھونک کر رابعہ بائی بلڈنگ میں منعقد ہونے والی محفلِ میلاد میں دعویٰ کیا:۔

"اے بی ہمارے میاں نے جو عورت بولٹن مارکیٹ میں کر رکھی ہے اس نے ایک دن ایسا ہی شور کیا تھا — اس پر ہمارے میاں کو اس کا یقین آگیا اور نکاح کر بیٹھے۔ سمجھو اب یہ مس ڈورتھی بھی کہیں ہاتھ مارے گی۔ ارے ایک چھٹی ہوئی 'بمبئی' والی ہے —"

بمبئی کی زینب بائی بے وجہ ہی بُرا مان کر بولیں: "— مس ڈورتھی بمبئی کا کدھر ہے۔ وہ تو 'گوا' کا ہے۔"

مس ڈورتھی گوا کی تھی۔ یہ بات اس نے کب چھپائی تھی — وہ تو کئی بار کوریڈور میں کھڑے کھڑے زینب بائی اور رضیہ بیگم کے سامنے بتا چکی تھی کہ وہ جب چھوٹی سی تھی تو گوا سے اپنی ماں کے ساتھ بمبئی آئی تھی — اور بمبئی اسے بہت پسند تھا۔ بہت زیادہ۔

"اُدھر ہم اسکول پڑھا، ادھر ہمارا مدر ایک بہت بڑا سیٹھ کے بچوں کا گورنیس تھا۔" اس بیان سے ڈورتھی دیوار سے ٹک جایا کرتی۔ اور اس کی آنکھیں دور دیکھتیں۔

"گورنیس تمہاری ماں؟" ایک بار رضیہ بیگم نے جل کر پوچھا۔

"گورنیس — مطلب بچوں کا دیکھ بھال کرنے والا — اس کو گورنیس بولتا انگلش میں۔" ڈورتھی نے نرمی سے سمجھایا۔

"آیا سمجھو۔" رضیہ بیگم نے قصہ مختصر کیا تو ڈورتھی اپنے جاپانی کھڑاؤں پر کھٹ کھٹ ڈولتی اپنے کمرے میں چلی گئی تھی — اس کے پیچھے زینب بائی اپنے "بچّے" کو گود میں اُٹھائے پہنچ گئیں تھیں کیونکہ اس وقت مس ڈورتھی ان کے "بچّے" کو ٹافی کا پیکٹ دینے کے بعد ہی تو اپنے بچپن اور اپنی ماں کا ذکر کرنے لگی تھی۔

اس دن وہ کتنی دیر تک زینب بائی کو اپنے بارے میں بتاتی رہی تھی۔

بے شک ــــ بے شک ــــ" حنیف نہایت یقین سے کہتا ــــ

"لیکن غیر مذہب والی سے عشق میں کیا حرج ہے ــــ" حنیف جی ہی جی میں اپنے آپ کو قائل کرتا ــــ کیونکہ وہ اس دن سے ڈورتھی پریرا پر باقاعدہ مرنے لگا تھا جب سے ڈورتھی اس کی فیکٹری میں موٹر سے اُتر کر اچانک آگئی تھی۔ حنیف اور سارے کاریگر ڈورتھی کو دیکھ کر ایسے بوکھلائے تھے کہ صف بستہ کھڑے ہوگئے۔ ایک تو ڈورتھی تھی، اس پر سے موٹر سے اتری ہوئی۔ اور پھر وہ بول بھی رہی تھی۔

"دیکھو ہم ایسا مافق گولڈن سینڈل مانگتا۔ اِدھر بازار میں نہیں ملیں گا۔" ڈورتھی نے اپنے بٹوے سے مارلین منرو کی نیم برہنہ تصویر نکالی اور ایک کاریگر کی طرف بڑھادی۔ سینڈل منرو کے پاؤں میں تھی۔

"میں پروپرائٹر ہوں۔" حنیف نے بمشکل آواز نکالی تھی۔ اس کے بعد چند لمحے میں قیمت طے ہوئی اور ڈورتھی اپنی مخصوص مترنم کھٹ کھٹ کرتی رابعہ بائی بلڈنگ کا زینہ چڑھ گئی تھی۔ لیکن حنیف کی روح ڈورتھی کے ساتھ ساتھ کھنچی چلی گئی ــــ حنیف نے کبھی تیسری منزل پر قدم نہیں رکھا تھا۔ حالانکہ دلّی والے صاحب کئی بار کہہ چکے تھے کہ میاں دلّی لکھنؤ کی لڑائی بند، اب تو کراچی ہی سب کچھ ہے کسی دن ہمارے یہاں آؤ تمہاری خالہ تمہاری بہت تعریف کرتی ہیں کہ بڑا شریف بچہ ہے کبھی کسی کو نظر اُٹھاکر نہیں دیکھتا۔" لیکن حنیف کو اپنے کام سے فرصت ہی کب ملتی دوسرے رضیہ بیگم (تمہاری خالہ) اپنی نوجوان بیٹی کے ساتھ اتنی بار برقعہ الٹ پلٹ کر اس سے اپنی بیٹی کی سینڈل بنانے کو کہہ چکی تھیں کہ اسے ان سے ڈر لگنے لگا تھا ــــ آخر وہ اُنھیں اتنی بار بتاچکا تھا کہ وہ پرایویٹ آرڈر نہیں لیتا۔ اس کے بنے ہوئے جوتے لینا ہیں تو دُکان سے جاکر لو ــــ ہمیں کوئی موچی مقرر کیا ہے ــــ؟

مگر اس دن اس کا جی بے ساختہ چاہا تھا کہ رضیہ بیگم کے گھر ہی چلا جائے، آخر تو وہ گھر بھی تیسری منزل پر ہی ہے ــــ تیسری منزل جہاں ڈورتھی پریرا رہتی ہے جس کے گھر کی سجاوٹ اور صفائی کے بڑے چرچے تھے۔ جو موٹروں میں بیٹھ کر آتی جاتی تھی ــــ موٹریں جو اس کی نہیں تھیں، بلکہ زینب بائی کی زبانی یہ روایت عام تھی کہ یہ موٹریں

فلم کمپنیوں کی ہیں۔ جہاں ڈورتھی ہیروئینوں کو ناچ سکھانے جاتی ہے۔ اور خود بھی فلموں میں ناچتی ہے ـــــ یہ کون سی فلمیں تھیں ان کا نام کوئی نہیں جانتا تھا ـــــ ایک بار حنیف نے کراچی کے ایک فلم کے گروپ ڈانس میں ڈورتھی کی سی جھلک دیکھی تھی اور وہ اپنے ساتھ کے لڑکے کو بتانے ہی لگا تھا کہ وہ غائب ہوگئی ـــــ۔

"سُنا ہے یار ہزاروں لیتی ہے ـــــ" اس کے ساتھ کے لڑکے نے مرعوب ہو کر کہا ـــــ" ویسے اپنا یار کلو خاں کہہ رہا تھا کہ ہوٹلوں میں لونڈوں کے ساتھ ناچتی ہے اس کے بھی بڑے پیسے ملتے ہوں گے ـــــ؟ کوئی یہ بھی کہتا ہے کہ ناچنا تو بہانہ ہے کماتی ہے ـــــ" حنیف کا ساتھی لڑکا اطلاعات پر اطلاعات بہم پہنچاتا رہا۔ اسے خبر نہ تھی کہ حنیف تو جانے کب سے ڈورتھی کا مداح تھا۔ اگر تیسری منزل پر دوسری منزل کے بابو صاحب کی بےعزتی کا قصہ نہ ہوتا تو حنیف کب کا اظہار عشق کر چکا ہوتا۔

یار پتہ نہیں چلتا لوگوں کا ـــــ کوئی کچھ کہتا ہے کوئی کچھ ـــــ" حنیف جب جوتے بنانے والے کاریگروں سے ڈورتھی کے بارے میں مختلف قسم کی باتیں سُنتا تو اکتا کر کہا کرتا تھا ـــــ لیکن جب اپنے اصول کے خلاف مس ڈورتھی کے دیئے ہوئے نمونے کی سینڈل خود بیٹھ کر بنانا شروع کر دی تو استاد کاریگر بندو (معنی خیز ہنسی ہنس کر بولے تھے ـــــ

"کیوں میاں کانٹے میں سینڈل کا چارہ لگا رہئے ہو ـــــ"

اور سچ مچ یہ سینڈل چارہ بن گئی ـــــ

یہ بھی اتفاق تھا کہ حنیف اس رات سنہری سینڈل کی کتر بیونت میں پھنسا رہا اور دیر کلّو لکھنوی کے تنور پر دیر سے پہنچا، کھانا ختم ہو چکا تھا، صرف چنے کی دال گوشت کی ایک رکابی بچی پڑی تھی ـــــ وہ کھا کر اپنی شو فیکٹری میں بستر بچھا کر لیٹا تو مس ڈورتھی کی دی ہوئی،، مارلین منرو" کی تصویر، سینڈل کا نمونہ ذہن میں اُتارنے کو پکڑ لی۔ بس پھر اس نے اتنی رات گئے تک ڈورتھی کی پسندیدہ سینڈل دیکھی کہ وہ پوری ٹانگ ہی اُسے ڈورتھی کی ٹانگ لگنے لگی۔ اس گڑبڑ میں ہاضمہ بگڑ گیا ـــــ صبح صبح اپنے گراونڈ فلور کے مشترکہ غسلخانے کی طرف بھاگا۔ غسلخانہ اندر سے بند پا کر دوسری منزل پر مشترکہ چیزوں کو گالیاں دیتا گیا۔ مسٹر ڈگلس اسے دیکھ کر باتیں کرنے کے موڈ میں آنے لگے تو وہ ہاتھ سے اشارہ کرتا غسلخانے کی طرف چلا گیا۔

مگر ایک فلش خراب تھا اور گندگی کے سمندر میں تیر رہا تھا۔ دوسرا بند ـــــ تیسری منزل پر ایسی کیفیت میں جانے کا تصور اس کے ذہن میں کیسے ہو سکتا تھا مگر وہ بے سوچے سمجھے تیسری منزل پر تھا ـــــ جونہی اس نے دروازے کے ہینڈل پر ہاتھ مارا ـــــ اندر سے چٹخنی کھلی اور وہ باہر نکلتی ہوئی مس ڈورتھی سے ٹکرا گیا ـــــ مس ڈورتھی کے منہ سے آدھی سلگی ہوئی سگریٹ اس کے جاپانی کمونو پر سے ہوتی زمین پر گری اور المونیم کا مگ دروازے سے ٹکرا کر بجا ـــــ

"بلو!" ڈورتھی کے منہ سے گھبرا کر نکلا لیکن وہ غسلخانے میں بند ہو گیا۔ غسلخانے کی عجیب سی بو اور سگریٹ کا دھواں ـــــ "یہ مشترکہ چیزیں بھی خوب ہوتی ہیں،" حنیف کے ذہن میں کوندسی ہوئی۔

اس کے ہوش ٹھکانے آئے تو وہ عجیب سی کیفیت میں ہنس پڑا ـــــ کچھ حیرت، کچھ مایوسی اور کچھ ہمدردی سی کیفیت ـــــ

مس ڈورتھی کو اسے یہاں ملنا چاہئے تھا یا نہیں ـــــ یہ الگ بات ہے، مگر حنیف ڈورتھی سے کئی بار کہہ چکا ہے کہ یہ سسرے فلم اور ناول والے ناحق ہیرو ہیروئین کو ملانے کے لئے سمندر، باغ، اور موٹریں ڈھونڈتے ہیں۔ تب ڈورتھی اُسے انگریزی میں گالیاں دینے لگتی ہے۔

ہاں تو حنیف نے وعدے کے مطابق اس شام سینڈل تیار کروالی۔ صبح کے واقعہ کے بعد جانے کیوں وہ خود اس سینڈل کو ہاتھ نہ لگا سکا ـــــ اللہ جانے یہ مجبوب لوگ انسان کے ذہن میں کیا بن کر گھستے ہیں کہ بعد میں صدمے پر صدمہ ہی اُٹھانا پڑتا ہے۔

اگر اس شام حنیف سینڈل کا ڈبہ اُٹھائے تیسری منزل پر نہ جاتا قصہ یہیں ختم ہو جاتا۔

حنیف پہنچا تو ڈورتھی کے ڈرائنگ روم کا دروازہ کھلا ہوا تھا ـــــ

نیلی روشنی میں ہر چیز نرم نرم اور خوابناک نظر آرہی تھی۔ گلابی گرہ لگے پردے نیلی دری، سرخ سوتی قالین، گدے دار کرسیاں اور کاغذی پھول ـــــ اور گدے دار کرسی میں دھنسا ہوا گدیلے جیسا ایک آدمی ـــــ حنیف کو ایک دم یاد آیا کہ نیچے ایک موٹر کھڑی ہے۔ اور اسے اپنے پاؤں میں پڑا ہوا جوتا نیچے دبا تا محسوس ہونے لگا۔

دوسرے لمحے ڈورتھی گولڈن سینڈل پہنے یہ دیکھ رہی تھی کہ کاٹتی تو نہیں۔ اس وقت اس کے جسم پر سیاہ کامدانی کی ساری تھی۔ حنیف کو اس کے پنوں سے سمٹے ہوئے سنہرے بال، سیدھی مانگ اور سانولے چہرے کے ساتھ عجیب سے لگے۔

"بیوٹی فل چوائس" موٹا اسے خوابناک نظروں سے دیکھ کر بولا

"کیا قیمت ہے؟" پھر وہ حنیف سے مخاطب ہوا تھا۔

"کس کی؟" حنیف نے طنزاً پوچھا۔

"چالیس روپے ڈیر ——" ڈورتھی نے اپنا ٹوا کھولتے ہوئے جواب دیا۔ اور موٹے نے دس دس کے پانچ نوٹ حنیف کی طرف بڑھا دیئے۔

"سب رکھ لو انعام ہے ——" موٹے نے کہا اور حنیف کے پیروں تلے جیسے اسپرنگ آگئے —— وہ اچھلا اور اس نے موٹے کے گریباں پر ہاتھ ڈال دیا —— ڈورتھی نئی سینڈل کی ایڑیوں پر توازن کھونے لگی۔

"کیا سمجھا ہے ہم تیرے نوکر ہیں بھڑوے ——؟" حنیف چیخا —— اور ساری خوابناک فضا بدل گئی —— موٹا گردن بچا کر ہاتھ اٹھانے لگا۔

"آئی۔ ایم ویری سوری —— مسٹر —— پلیز —— پلیز ——" ڈورتھی دونوں کے بیچ میں آگئی اور اس نے ایک دم حنیف کے ہاتھ پر ہاتھ رکھ دیا —— دوسرے لمحے حنیف تیسری منزل سے اتر رہا تھا —— ہتک کے احساس سے تلملایا ہوا۔ اس نے فٹ پاتھ پر بکھری چمڑے کی رنگین کترنوں پر سے گزرتے ہوئے اس موٹر کو دیکھا جس میں بیٹھ کر ڈورتھی اس موٹے کے ساتھ جانے والی تھی —— اس نے اپنی بندھی ہوئی مٹھی کالی موٹر پر ماری اور پھر آگے بڑھ کر مٹھی پر لگی ہوئی گرد کی تہہ کو پھونک مار کر اڑا دیا۔

"سالے نے ہمیں موچی سمجھا، ایسا ٹھونکتا کہ بیٹا کو چھٹی کا دودھ یاد آجاتا۔ وہ اگر بیچ میں نہ آجاتی تو ——!" حنیف ایرانی کے ہوٹل کی طرف جاتے ہوئے دانت کٹکٹاتا رہا تھا۔

"اماں حنیف تمہیں بیوقوف ہو خواہ مخواہ نواب میرزا غن صاحب کی مثال سامنے

رکھ کر یہ جوتے سازی شروع کر دی ـــــ بت کہا کرتے تھے کہ موتی موتی رہے گا۔ نواب موتی جوتیوں میں ٹانک لو ـــــ یہاں کراچی میں تمہیں کوئی کیا جانے کی باوا خاندانی تھے۔ میاں پڑھ لیتے تو باوا کی طرح دفتر کے سپرنٹنڈنٹ ہوتے ۔ نویں پاس کر کے دسویں کرنے میں کون سے پہاڑ ڈھونا پڑتے ؟ ـــــ "

لیکن جب حنیف رات کو کئی گھنٹے ایرانی کے ہوٹل میں بیٹھ کر اپنی فیکٹری کو خواب گاہ بنانے لوٹا تو وہ اپنے آپ کو سمجھا چکا تھا ـــــ " اونہہ بڑے بڑے لوگ آج کل قسم قسم کے کاروبار کرتے ہیں ۔ وہ اپنے سید صاحب کھالوں کا کاروبار نہیں کرتے ؟" پھر اس نے باہر نکل کر اپنے کمرے پر لگا ہوا بورڈ پڑھا۔ "فینسی شو میکرز" اور اس سے اُسے بہت تسلّی ہوئی۔ شکر ہے کہ ملک میں ایک ایسی زبان موجود ہے جس میں بُرے سے بُرا مفہوم بھی کچھ بھلا لگنے لگتا ہے۔ اگر اس جگہ فصیح اردو میں لکھا ہوتا "عمدہ جوتا بنانے والے موچی" تو جی پہ کیا گزرتی ۔

تب اس نے لات مار کر اپنا لپٹا ہوا بستر کھسکایا اور اس پر ایسے تکلف سے بیٹھ گیا جیسے کسی ڈرائنگ روم کے صوفے پر ٹکا ہو ۔

"پروپرائٹر فینسی شو اسٹور" ، اس نے زیر لب دُہرایا اور دیوار کی طرف یوں دیکھنے لگا جیسے ڈورتھی اس کے سامنے ہو۔ آپ کی تعریف ؟ ـــــ

"مس ڈورتھی مگ والی ـــــ" اس کے ذہن میں ایک دم اُبھرا اور وہ منتقمانہ انداز سے ہنس کر اپنے جوتے اتارنے لگا ۔ اور پھر کپڑے ـــــ وہ اس وقت اتنا پُراعتماد تھا کہ ڈورتھی سچ مچ اس کے سامنے ہوتی تو وہ ذرا نہ کانپتا۔

لیکن ڈورتھی اُس وقت آئی جب حنیف سوتے ہوئے خواب دیکھ رہا تھا کہ اس کی بیوی اور ماں آگئیں ہیں ـــــ کراچی میں اُسے بغیر پگڑی دیئے اپنے کارخانے کے قریب ہی ایک کمرہ مل گیا ہے ـــــ بیوی اور ماں جو لکھنؤ سے آ کر ابھی تک اس کے ماموں کے یہاں راولپنڈی میں پڑی کراچی پہنچنے کے لئے دن گن رہی تھیں ۔ اس نے دیکھا کہ اس کی بیوی پاس بیٹھی ہے، وہ چومنا چاہتا ہے تو شرما کر سر اِدھر اُدھر کر لیتی ہے ـــــ ہاتھ جھٹک دیتی ہے۔

تب اس کی آنکھ کھل گئی ۔ کمرے میں بدستور روشنی تھی اور ڈورتھی اس کا ہاتھ پکڑ کر ہلا رہی تھی ـــــ

ہم اُدھر اکھّا ٹائم دیورے وقت ، پریشان ہوا ـــــ آئی ایم ویری سوری ـــــ وہ تمہارا " انسلٹ کیا، ہم کو بہت گسہ ہوا۔ تم اپنا چالیس روپیہ ہمارا فلیٹ میں چھوڑ آیا تھا ـــــ یہ لو مسٹر۔"

ڈورتھی الگ کھڑی جانے اور کیا کیا کہے جا رہی تھی ۔ اس کے سنہرے بال پنوں کی قید سے کہیں کہیں آزاد ہو کر لمبے ہونے کی چغلی کھا رہے تھے ۔ سو ہونٹ خشک اور آنکھوں میں نیند کے ساتھ ہمدردی کی آنچ آتی ہوئی ـــــ حنیف کو لگا کہ ابھی تک وہ خواب دیکھ رہا ہے ۔

" تم اب ناراض نئیں ہوئیں گا ۔ ہمارے کو لوگ کا دل ہرٹ دکھانا) نئیں مانگتا ۔ ام ادھر کسی کا روم میں کبھی نئیں گیا پن ہم سوچا ادھر ضرور آئے گا ۔ کسی کو مت بولنا ـــــ ہم کسی کا انسلٹ نہیں مانگتا ۔ اس کا واسطے ہم ادھر کو سوری بولنے آیا ـــــ اپنا پیسہ لو ـــــ "

اور جانے کیسے حنیف کا چکراتا ہوا سر گھٹنے پر آگیا ـــــ ایک بار پھر اُسے اپنی بے عزتی کا واقعہ جی مسوستا لگا ۔ یا پھر جانے کیا بات تھی ۔ وہ رونا چاہتا تھا رو پڑا ۔ ڈورتھی تڑپ کر اس کے قریب آگئی ـــــ اس نے جھک کر اس کے گال پر بوسہ دیا ـــــ " نہیں روئیں گا ـــــ نئیں ـــــ " ڈورتھی بول رہی تھی ۔

مگر حنیف کے اندر دھم سے لاوا پھٹ پڑا ـــــ ڈورتھی اس کے کمرے میں تھی ۔ اس لیئے پولیس کو بلانے کی دھمکی نہ دے سکی ۔

" آئی لو یو ـــــ مس ڈورتھی آئی لو یو ـــــ " حنیف کے منہ سے جدوجہد کرتی ہوئی ڈورتھی کو لپٹانے کی کوشش میں انگریزی کا یہ فقرہ بار بار ٹپک پڑتا ۔

آخر ڈورتھی نے ہار کر جیسے خود حفاظتی کے لئے چاقو کا پھل چمکایا ۔

تب تم چالیس سینڈل کا چھوڑیں گا اور دس اور دینگا ـــــ "

رابعہ بائی بلڈنگ کے مکینوں کو اس رات کے سودے کی خبر نہ ہوئی تو کیا ہوا ۔ بعد میں جو سودے ہوئے ان کا تو رضیہ بیگم کو رتّی رتّی علم تھا ۔ ڈورتھی کے پیروں میں جو روز نئے نئے سینڈل ہوتے وہ کہیں چھت سے تو نہ گرتے ظاہر ہے کہ نیچے سے آتے ـــــ اور وہ جو روز صبح ڈورتھی کا چھوکرا سلیقے سے لگی ہوئی چائے کی ٹرے لے کر نیچے جاتا اور نیچے سے توس چپاتی کی ٹرے لاتا، وہ محض کاروبار تو نہ تھا ۔

رضیہ بیگم سینہ ٹھونک کر کہتیں ـــــ ایسی عورتیں مرد سے چائے بنوا کر پیتی ہیں ـــــ

عورتیں اپنے کمروں سے جھانکنے لگتیں — ایک دن رضیہ بیگم کی بیٹی نے زینب بائی کی موجودگی میں بڑے چاؤ سے کہا۔ "اے اماں جان ڈورتھی جیسی سرخ سینڈل ہمیں بھی بنوا دو — ہم کہیں جاکر حنیف بھائی سے —؟"

اس پر رضیہ بیگم کا ماتھا ٹھنکا — "لو بھئی اب ہماری لڑکیاں اس کی ریس کریں گی۔ اور یہ حنیف خدا کی مار ہو اس پر، شریفوں سے تو یوں بھاگتا ہے جیسے کاٹ لیں گے — میری بچی کی سینڈل نہ بنا کر دی کبھی — اور اس حرافہ کے لئے روز بغل میں ڈبے دبائے حاضر۔"

یہ پہلا موقعہ تھا کہ رضیہ بیگم چیخی چلائیں نہیں۔ بلکہ اُنھوں نے برقعہ اوڑھ کر پوری رابعہ بلڈنگ کے بال بچّے دار لوگوں کو خطرے سے آگاہ کیا —

"ڈائن بھی اپنا پڑوسن چھوڑ کر کھاتی ہے —" ان کے پاس سب سے بڑی دلیل یہی تھی۔ دوسرے دن وہ وفد بن گیا جس نے رابعہ بائی بلڈنگ کی مالک حلیمہ بائی سے شکایت کی اور حلیمہ بائی کے کارندے کو تحقیق کے لئے تیسری منزل پر آنا پڑا۔

ڈورتھی کا نیلے پینٹ اور چمکتے ہوئے ہینڈل والا دروازہ بند تھا۔ زینب بائی کو خوشی ہوئی کہ اس وقت ڈورتھی اکیلی ہے۔ وہ سانس روکے اپنے دروازے پر کھڑی تھی — اور رضیہ بیگم اپنے میاں کے پیچھے دوپٹہ منہ پر ڈالے لیکن سینہ کھولے کھڑی سوچ رہی تھیں۔ "دیکھیں سب باتوں پر "نہ" کر دے، مگر حنیف کے قصے پر کیسے مکرتی ہے ؟—"

دوسری منزل پر وائلن بج رہا تھا اور تیسری منزل کے بند کمرے میں ایڑیوں کی کھٹ کھٹ ہو رہی تھی، کچھ دنوں سے ڈورتھی ہسپانوی خانہ بدوش ناچ کی دلدادہ ہو گئی تھی۔

حلیمہ بائی کا کارندہ اپنے بید سے کوریڈور میں تالی دیتا رہا۔ اس کے پیچھے بلڈنگ کے بیشتر مکین مرصوف بستہ تھے — وائلن بند ہو گیا — کھٹ کھٹ ہوتی رہی، پھر کارندے نے اپنے بید کی مٹھ سے دروازہ کھول دیا۔

زینب بائی کا دل دھڑکتے دھڑکتے رک گیا۔ ڈورتھی بند دروازے کے پیچھے آج اکیلی نہیں تھی۔

وہ حنیف کی گردن میں بانہیں ڈالے ابھی تک ایڑیاں بجا رہی تھی — جیسے ذبح کی ہوئی مرغی پھڑک رہی ہو۔

اے بی جب وہ مرد کو چائے بنا کر بھیجنے لگیں تو سمجھو کمبخت کی جان کو چمٹی ——— ،،
رضیہ بیگم کی یہ تھیوری کوئی تسلیم کرنے کو تیار نہ تھا ——— بیشک حنیف کئی بار تیسری منزل پہ ڈورتھی کے یہاں آیا تھا ——— مگر بیٹھا کھلے دروازے کے سامنے ——— رضیہ بیگم منہ پہ دوپٹے کی آڑ کیے کئی بار ایسے موقعے پر غسلخانے جانے کے بہانے اِدھر جھانکیں ——— لیکن کسی قابل اعتراض نظارے سے محروم رہیں ——— پھر بھی انھیں یہ غم تھا کہ حنیف جیسا بھلا آدمی خراب ہو کر رہے گا۔ اور دیکھنے والے دیکھتے کہ حنیف کے خراب ہونے میں کسر بھی کیا رہ گئی ہے۔ یا تو تمام دن اپنے کاریگروں میں گھرا آپ بھی رنگین چمڑے کی پتلی پتلی چٹیں مشین پہ سیا کرتا یا چلتے پھرتے انھیں چٹوں کی چوٹیاں سی گوندھتا رہتا۔ اب استاد بندو کاریگر رابعہ بائی بلڈنگ کے ہر مکیں سے حنیف کے کاروباری مستقبل کی تباہی کی پیشین گوئی کرتے رہتے ——— واقعی وہ تو یکسر بدل گیا تھا۔ جانے ڈورتھی اُسے چائے میں کیا الّو کی دم گھول کر بھیجتی تھی ——— جب دیکھو جب تیسری منزل پر دھما دھم چڑھتا، سوٹ ڈاٹے، ہاتھ میں ٹائی پکڑے چلا آرہا ہے۔ ڈورتھی اسے روز ٹائی باندھنا سکھاتی لیکن روز بھول جاتا اور پھر ڈورتھی سے بندھواتا ——— وہ دونوں کبھی کبھی رکشا میں بیٹھ کر باہر بھی جانے لگے ——— مگر ڈورتھی رات کو تو اکثر فلم کمپنی کو جاتی ——— ایسی صبح حنیف ڈورتھی کی بھیجی ہوئی چائے واپس کر دیتا۔

،، فلم کمپنی کو تو جانا ہی مانگتا ——— حنیف بہت گلتی کرتا (غلطی) تم بولو بائی ہم ناچیں گا نہیں تو مر جائینگا۔ ——— تم جانتا بائی ہم کو ناچ کا بہت شوق ہینگا۔،،
ڈورتھی چائے واپس آنے پر اداس ہو کر زینب بائی سے شکایت کرتی۔ اور پھر کواڑے بند کر کے اپنی صبح صبح کی مشق شروع کر دیتی ——— اس کا دیوانوں کی طرح مست ہو کر ناچنا زینب بائی تک کو بھلا لگتا ——— اس پر سے دوسری منزل کے مسٹر ڈگلس کا وائلن جیسے پکارنے لگتا۔ ڈورتھی ناچ رہی ہے! ——— ڈورتھی ناچ رہی ہے!!
اس اطلاع پر حنیف کے گلے شکوے مٹ جاتے۔ اور زینب بائی دیکھتیں کہ حنیف دالانے میں کھڑا ڈورتھی کو یوں دیکھ رہا ہے جیسے اس پر مسمریزم کیا گیا ہو۔
ڈورتھی جب حنیف کے ساتھ گھر سے نکلتی، تو اس کی ساری کے ساتھ ہم رنگ سینڈل ہوتی۔ وہ مترنم سے کھٹ کھٹ کرتی زینہ اُتر جاتی ——— تو تیسری منزل کی

"دیکھا ___ دیکھا یہ رنڈی خانہ بنا رکھا ہے ___" دلّی والے صاحب سب سے بولے ___ .

"باہر نکالو اس رنڈی کو ___" دوسری منزل کے بابو صاحب آگے بڑھکر چیخے۔ ڈورتھی اچھل کر الگ ہوگئی، پھر وہ چھوٹی سی گھگھری اور پیٹ کھلے بلاوز میں سینہ تان کر باہر آگئی۔

"تم ہمارا ڈور کیوں کھولا امین بھائی ___" بلڈنگ کے لوگوں نے پہلی بار ڈورتھی کی اونچی آواز سُنی وہ کارندے سے مخاطب تھی ___ "تم خود بند کرینگا ہمارا دروازہ۔ بند کرو ہم بولا بند کرو ___" ڈورتھی چیخی۔

"ہاں تاکہ تم یہاں مزے کرو ___" دلّی والے صاحب دانت پیس کر آگے بڑھے۔

"تم بھی اپنے گھر میں مزا کرنا مانگتا مولبی صاحب ___" ڈورتھی چیخی ___ "یہ ہمارا گھر ہے ہم اس کا کرایہ دیتا ہے"

"بڑی آئی ہمارے منہ لگنے والی، کمینی رنڈی حرّافہ شریفوں کے محلے میں ___" رضیہ بیگم اپنے میاں کی بے عزتی برداشت نہ کر سکیں اور بیچ میں کود پڑیں۔

اس کے بعد وہ ہوا جو نہیں ہونا چاہئے تھا ___ ڈورتھی نے اس شریفوں کے محلے کو ادھیڑ کر رکھ دیا۔ اسے انگریزی، اردو اور بمبیا میں جتنی گالیاں آتی تھیں وہ سب بک ڈالیں ___ اس نے الزام لگایا کہ رضیہ بیگم خود حنیف کو پھانسنے کی فکر میں تھی ___ نتیجہ عورتوں کی مارپیٹ کی صورت میں نکلا۔

"ہاں ہم حنیف پر مرتا۔ ہاں وہ ہم پر مرتا ہم اس کو اپنا جان بھی دینگا۔" ڈورتھی رضیہ خانم سے پٹتے اور پیٹتے ہوئے رو رو کر کہہ رہی تھی۔

تب ایک دم حنیف کے پتھر جیسے جسم میں جنبش ہوئی ___ وہ کوریڈور میں آگیا اور نچی کھچی ڈورتھی کا ہاتھ پکڑ لیا۔

"خبردار جو کسی نے اب میری عورت کی طرف آنکھ اُٹھائی" حنیف آنکھیں نکال کر گمبھیر آواز میں بولا۔

"مگر یہ تمہاری عورت نہیں ___" بابو صاحب پیچھے ہٹتے ہوئے کہہ گئے۔

اسی وقت نیچے سے حنیف کے سارے کاریگر بھرا مار کر اوپر پہنچ گئے۔ اب حنیف

اور اکڑ گیا ـــــ

"یہ میری عورت نہیں ؟ اچھا !!" حنیف کا منہ لال ہوگیا۔ پھر اس نے بندو خاں کاریگر کو دیکھا ـــــ "اے بھائی بندو خاں نیچے کسی کو دوڑانا تو ذرا لڈو لے آئے ـــــ آئیے مولانا دلی اور لکھنو کا جھگڑا تو وہیں رہ گیا ـــــ اب ہم کراچی میں ہیں ـــــ دو بول پڑھا دیجئیے۔ اللہ آپ کی مشکلیں آسان کرے گا۔"

یہ کہہ کر اس نے ڈورتھی کو سر سے پاؤں تک دیکھا اور ہلکا سا دھکا دے کر اسے کمرے میں دھکیل کر دروازہ بند کر لیا۔

حلیمہ بائی کے پاس کارندہ گیا تو نکاح کے لڈو لے کر ـــــ حلیمہ بائی کو سارے قصے سے صرف اتنی ہی دلچسپی تھی کہ ڈورتھی آئندہ بھی ان کی کرایہ دار رہے گی۔

مگر رابعہ بائی بلڈنگ کے مکینوں کی دلچسپی جیوں کی تیوں رہی۔

استاد بندو کاریگر حنیف کے کاروباری مستقبل کے بارے میں ضرورت سے زیادہ فکر مند رہتے ـــــ وہ کہا کرتے۔ "دیکھ لینا میاں، ایک دن جو خود بیٹھ کر حساب لگاؤ گے تو بدھیا بیٹھی نظر آوے گی۔ میاں جوتا سازی تو جبھی ہوئے ہے کہ مالک سر پہ بیٹھا رہوے ـــــ اب میں کام کر رہا ہوں تو کاریگروں کے ہاتھوں پر نظر بھی رکھ رہا ہوں ـــــ" مگر حنیف پاجامہ پہنے چپلیں گھسیٹتا تیسری منزل پر چلا جاتا اور ڈورتھی کو قورمہ، کباب پکانے کی صحیح ترکیب بتانے لگتا ـــ ڈورتھی یوں تو بڑی ذہین تھی لیکن مرچ مصالحے کا صحیح توازن قائم رکھنا بھی کوئی بچوں کا کھیل نہیں۔ روز کوئی نہ کوئی گڑبڑ ہو جاتی۔ ہاں جب وہ کمونو پر ایپرن باندھے انگیٹھی کے سامنے کھڑی جھپا جھپ چپاتیاں اتارتی تو حنیف کو اپنی بیوی کے ہاتھ کی چپاتیاں یاد آجاتیں۔ بیوی جو کراچی آنے کے لئے بیتاب تھی اور ہر دوسرے تیسرے دن اس کی اماں کی طرف سے خط لکھوا دیا کرتی تھی۔ اور یہ خط حنیف کی جیب سے ڈورتھی کے سپرنگ والے پلنگ پر گر جاتے تو وہ انھیں اٹھا کر رضیہ بیگم کے پاس لے جاتی۔ ہر خط میں ایک سی بات پڑھوا کر سننے کے بعد وہ اکتا سی جاتی لیکن ایک ہی سی ہمدردی کرنے سے رضیہ بیگم نہ اکتاتیں۔

"ہائے بے چاری کو کتنی دور ڈال رکھا ہے حنیف نے پھر تمہارا دل کیا کتنا ہوگا؟ ہمیں پہلے معلوم ہوتا کہ حنیف بال بچے دار ہے تو ـــــ"

"فوہ! فیر کیا۔ سب چلتا ——" ڈورتھی شانے اچکا کر کہتی اور کمونو کے اندر جلدی جلدی میں چھڑکا ہوا ٹیلکم پوڈر ہاتھ ڈال کر سینے پر ملنے لگتی۔ "وہ بولتا ہمارے کو اکھا جان سے پیار کرتا۔ جب سے وہ ہمارے کو دیکھا —— کیا ہو نے سکتا؟ —— پن دیکھو ادھر کراچی میں پگڑی بنا روم نہیں ملتا —— اُدھر بمبئی میں بھی پگڑی چلتا تھا —— ہم ادھر تین روم کا فلیٹ واسطے تین ہزار پگڑی دیا تھا ——" ڈورتھی کی نظریں کہتیں جیسے وہ ابھی بمبئی سے ہو کر آئی ہے۔ پھر وہ ایک دم اپنی جاپانی کھڑاؤں پر ڈولتی اپنے فلیٹ میں غائب ہو جاتی۔ اور جب مینڈ بیگم اس امید پر غسلخانے کا "چکر" لگاتیں کہ دیکھیں سوکن کے سلسلے میں وہ حنیف کی خبر کس طرح لے رہی ہے تو یہ دیکھ کر بڑی مایوسی ہوئی کہ ڈورتھی برش لئے دری پر سے حنیف کے جوتوں کا نشان جھاڑ رہی ہے —— جانے اب حنیف باوجود اس کی ہدایت کے جوتے مونج کی چٹائی پر رگڑنا کیوں بھول جاتا ہے۔ ڈورتھی بڑے پیار سے زینب بائی سے شکایت کر چکی تھی۔

حنیف کا کیا؟ سب دیکھتے کہ حنیف تو ڈورتھی کے قبضے میں آ کر عقل ہی چھوڑ بیٹھا تھا۔ وہ کاریگروں کو اُستاد بندو کے سپرد کر آرام سے کام نمٹانے کے لئے چمڑے کی لمبی لمبی رنگین اور روپہلی سنہری چٹوں کا "گچھا" لئے اوپر آتا —— مشین تو بہت پہلے ہی سے اوپر رکھی ہوئی تھی۔ وہ چمڑا مشین پر ڈال کر دری پر آلتی پالتی مار کر بیٹھ جاتا اور آواز لگاتا۔

"ڈارلنگ جلدی کھانا دو، آج بہت کام کرنا ہے۔" ڈورتھی دوسرے کمرے میں جلدی سے ایپرن کھول کر دوبارہ ٹیلکم پوڈر کمونو کے اندر چھڑکتی۔ چہرے پر پف مارتی اور آ کر مصنوعی "غصے" سے چلاتی۔

"تم ہندو مافق زمین پر بیٹھیں گا تو ہم کھانا نہیں دینے مانگتا ——" وہ منہ بنائے اس کا ہاتھ پکڑ کر کھینچتی، اندر جو دوسرے کمرے میں اس نے "ننھی" سی میز سجا رکھی تھی۔ اسے بیکار کیسے چھوڑ دیتی۔

"اوہ بھول گیا تھا میم صاحب —— بھول گیا تھا" حنیف اسے چومنے کی کوشش کرتے ہوئے کہتا اور کھانے پر ٹوٹ پڑتا اس کے بعد "بہت سا کام" بھول کر ڈورتھی کے پلنگ پر ایسا سوتا کہ اسے خبر بھی نہ ہوتی کہ ڈورتھی کب اٹھ گئی۔ کب اس نے حنیف کے جھوٹے برتن دھوئے اور کب اس کے ملے دلے سوٹ پر استری کی —— کب جوتے پر پالش کی۔

"ام بولتا کیسا سلی (بیوقوف) ہے حنیف ـــــ" وہ میلا جوتا اُٹھاتے ہوئے ہمیشہ بڑبڑاتی۔ "لوگ بولے گا آپ جوتا فیکٹری کا پروپرائٹر اور اتنا ڈرتی (گندہ) شو پہنتا۔ شام کو کدھر پکچر یا ہوٹل جانے کے لئے ٹائم اسی مافق پہن لیں گا ـــــ"

ڈورتھی کو شام اس کے ساتھ باہر جانے کا خطرہ ہر روز ستاتا ـــــ مگر حنیف یہ بھی بھول جاتا۔

"ہمارے کو دیکھ کر سب کچھ بھول لیں گا۔ سلی! اپنا بزنس تو کرنا ہی مانگتا۔" ڈورتھی مشین کے پاس چمڑے کی چٹیں دیکھ کر اور بھی غصہ ہونے لگتی۔ پھر مشین پر جھک کر چمڑے کی چیٹوں پر بخیہ کرنے لگتی۔

مشین کی آواز سن کر کئی بار زینب بائی اس کے یہاں آئی تھیں۔ ایسے موقع پر ڈورتھی ان کے سامنے شکایتوں کا دفتر کھول دیتی۔

"یہ حنیف ہمارے کو پاکر سب چھوڑ دیا۔ اکھّا دن ادھر رہیں گا ـــــ پھر بولتا بڑا لاس (نقصان) ہوتا وہ اپنا حساب کتاب بھی کرنے کو مانگتا۔ ہم مال کا سپلائی کا بل دُکان پہ جاکر نہ مانگے تو کاریگر لوگ کو شام میں پیسہ بھی نہیں ملیں گا۔ تم بولو بائی ایسا کیسا چلیں گا؟"

ڈورتھی مشین پہ جھکی مسلسل بولے جاتی اور اس کی سمجھ میں نہ آتا کہ زینب بائی کا بچّہ کیوں ٹھنکے جا رہا ہے۔ دراصل حنیف کے ساتھ رہ کر وہ خود بھی بھلکڑ ہو گئی تھی خود ہی سویرے جب بید کی ٹوکری لٹکائے سبزی گوشت کے لئے کارپڈور میں سے کھٹ کھٹ کرتی گزرتی تو بچّے کہہ جاتی۔ "بی بی تمہارے واسطے ٹافی لائیں گا" پھر جب وہ واپس آتی تو یہ وعدہ قطعی بھول جاتی۔

"تم کسی کو نہیں بولیں گا۔ ہم جانتا حنیف کا بزنس خراب ہو گیا۔" وہ کتنی ہی بار زینب بائی سے کہہ چکی تھی۔

لیکن یہ عجیب بات تھی کہ فینسی شو فیکٹری میں کاریگروں کی تعداد بڑھتی جا رہی تھی اور حنیف اپنے کرائی پڑوسی سے کئی بار کہہ چکا تھا کہ اگر وہ کمرہ چھوڑ دے تو وہ ڈیڑھ ہزار روپیہ پگڑی دینے کو تیار ہے ـــــ آخر نئے کاریگروں کو بیٹھنے کی جگہ چاہئے تھی۔

اسی وجہ سے رضیہ بیگم اور ان کے میاں کا کہنا تھا کہ "حنیف ڈورتھی کی کمائی بھی کھاتا ہے یہ نکاح کو تو پردہ ڈالنے کو تھا" رضیہ بیگم چپکے سے کہا کرتیں۔

"بائی ہم کس طرح بولیں گا۔ ڈورتھی تو فلم کمپنی جانا بھی چھوڑ دیا شام کو ـــــ" زینت بائی پریشانی سے سر ہلاتیں۔

"اے چلو رہنے دو۔ دن کو جو بن ٹھن کر جایا کرتی؟ ـــــ" رضیہ بیگم کے پاس منطق جو موجود تھی۔

"او بی بی ہم کو پتہ ہے۔ حنیف کا بزنس بل لینے جاتا۔ اور سبزی گوشت بھی تو بازار سے لاتا۔ چھوکرا ابھی تو نکالا ہے ڈورتھی نے ـــــ"، زینب بائی بتاتیں۔

"ہونہہ! سب بہانے ہیں بی۔ اگر کچھ نہ ہوتا تو یہ روز روز ناچ کی کھٹ کھٹ نہ بند ہو جاتی اور نیچے اب بھی بڈھا کھٹ کھٹ کے ساتھ انگریزی سارنگی کی ٹوں ٹوں کرتا ہے !!"

رضیہ بیگم پاؤں پٹختی اپنے کمرے میں جا کر پان منہ میں ٹھونس لیتیں۔ اور زینب بائی ایک بار پھر یہ بتانے کو بے چین رہتیں کہ ڈورتھی نے حنیف سے کہہ دیا ہے کہ ناچ تو اس کی زندگی ہے ـــــ وہ نہیں ناچے گی تو مر جائے گی۔ پھر حنیف کی بھی اس کے ہسپانوی ناچ پر جان جاتی ہے ـــــ ہاتھوں میں ننھی ننھی مجیریاں، جسم پر ذرا سی جھالروں والی گھگھری اور چولی زینب بائی نے تو خود اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا کہ ناچ کے وقت حنیف پاجامے کے بجائے سوٹ پہن کر بیٹھتا اور ڈورتھی اس کے سامنے ناچتی۔

"ہمارے کو پاجامہ اچھا نہیں لگتا، پن حنیف پہننے کو مانگتا۔ ہم بولتا اکھا دن سوٹ پہنے گا تم؟" ڈورتھی زینب بائی سے شکایت کرتی، اور پھر خود ہی کہنے لگتی۔ "حنیف کا بزنس ڈاؤن ہے۔ کام بہت کرتا تھک جاتا ـــــ اس کر کے ہم اس کا بزنس کا بہت خیال کرتا، بزنس اچھا ہوئیں گا تو ہم منیجر رکھیں گا فیر ہم دونوں روز ایوننگ کو باہر جائیں گا۔ ہوٹل، پکچر، کلفٹن ـــــ"، ڈورتھی یہ سب کہتے کہتے اپنی کالی آنکھیں نیم وا کر لیتی۔ اس کے جبڑوں کی ابھری ہوئی ہڈیوں تلے دبے ہوئے رخساروں کی ندی سی نمایاں ہو جاتی اور چوڑا دھانہ ذرا سا کھل جاتا جس میں سونے سے مڑھا ہوا دانت چمک اٹھتا۔

بکرانی نے اپنا کمرہ حنیف کو دے دیا۔ کاریگروں کی تعداد بڑھتی ہی گئی۔ اس کمرے کے ایک کونے میں ڈورتھی کے کھانے کی ننھی سی میز پہنچ گئی۔ یہاں بیٹھ کر اب حنیف نادہندہ پڑھتا جاتا اور کام کی نگرانی بھی کرتا جاتا۔ ـــــ مال سپلائی کرنے کے جو آرڈر

آتے اُنھیں بھی لیتا ــــ مگر اس موقع پر ڈورتھی کو ڈوڑنا پڑتا۔ جیسے ہی کوئی موٹر یا موٹر سائیکل رکشا نیچے رکتی ڈورتھی ہزار کام چھوڑ کر نیچے بھاگتی۔

دیکھا یار آئے ہیں پُرانے ــــ رضیہ بیگم ہانک لگاتیں ــــ اور زینب بائی جواب دینا ضروری سمجھتیں۔ اب یہ ان کی بدنصیبی تھی کہ ڈورتھی سے ان کی دوستی تھی اور وہ اُنھیں ہر بات بتاتی تھی۔

"ڈورتھی نیچے مال مانگنے والے کے سامنے جاکر ایڈوانس کے واسطے بولیں گا بائی۔ حنیف نہیں بولنے سکتا ــــ ڈورتھی بتانا، بغیر انگریزی لوگ ایڈوانس نہیں دیتا ــــ"
زینب بائی بتاتیں اور رضیہ بیگم کھڑکی سے نیچے جھانکتی ہوئی اپنی بیٹی کے ساتھ مل کر اتنا ہنستیں کہ ان کے آنسو نکل آتے۔

دوسری منزل کے بہاری بابو صاحب اپنی بوہرہ پڑوسن کو قسم کھاکر بتا چکے تھے کہ حنیف نے بگڑی کے ڈیڑھ ہزار روپے اس کے بنک ہی سے نکلوا کر مکرانی کو دیئے۔ اور بنک میں اکاونٹ ڈورتھی کے نام کا تھا۔

"اور اب دیکھو اسے چلاتا ہے ــــ کیسا بے غیرت ــــ"
لیکن مسٹر ڈگلس ہمیشہ بوہرہ عورت سے کہتے "دیکھا عیسائی وائف اپنے ہسبنڈ کی کتنی مدد کرتی ہے۔ اس نے حنیف کو کیا بنا دیا ــــ پھر تم کو پتہ ہے وہ ہسپانوی ناچ کتنا اچھا ناچنے لگی ہے ــــ وہ تو ہمیشہ سے ناچ کی دیوانی ہے ــــ جب ذرا سی تھی سیٹھ کی لڑکیوں کو دیکھ کر منٹ بھر میں ناچ کی نقل کر لیتی ــــ تھی ــــ"

اور بوہرہ عورت بڈھے ڈگلس کو یوں دیکھتی جیسے وہ پاگل ہو۔ یہ پاگل پن کی بات نہ تھی تو کیا کہ ڈورتھی کی کھٹ کھٹ کے سمے وہ ہمیشہ وہ نیچے ہوتا۔ پھر بھی اسے علم تھا کہ ڈورتھی کیسا ناچ رہی ہے۔

پھر ایک دن رضیہ بیگم کے لکھے ہوئے خط کے جواب میں راولپنڈی سے حنیف کی بیوی، ماں اور دونوں بیٹیاں آگئیں۔ روتی، بین کرتی وہ سیدھی تیسری منزل کے کاریڈور میں آکر برقعے اُٹھا کر بیٹھ گئیں۔

"ارے کیا کر ڈالا ــــ ارے پردیس میں ڈال کر منہ پھیر لیا ــــ ارے کراچی میں

"حنیف کی بیوی نے سینے پر ہاتھ مار مار کر ایسے درد سے بین کیا کہ
راس رچالیا ——
رضیہ بیگم، زینب بائی اور بلڈنگ کی دوسری عورتیں بھی اس کے گرد اکٹھا ہو کر رونے لگیں۔
حنیف کا چہرہ غصے سے سُرخ ہو گیا۔ وہ اب اتنی عورتوں کے سامنے اپنی بیوی کا منہ تھپڑوں
سے تو بند کرنے سے رہا تھا —— اس نے اسے گھسیٹ کر ڈورتھی کے فلیٹ میں ڈال دیا
اور پھر آہستگی سے اپنی اماں کا ہاتھ پکڑ کر اُٹھایا۔
"اماں کیا کروں یہاں مکان نہیں ملتا۔ ورنہ آپ کو پہلے بُلا لیتا ——"
تب ڈورتھی سبزی گوشت کی ٹوکری اُٹھائے تیسری منزل پر نمودار ہوئی۔ عورتیں
اب تک کوریڈور میں جمع تھیں۔
"حنیف بھائی ڈورتھی آگئی ——" رضیہ بیگم نے منہ پر دوپٹہ ڈال کر بآوازِ بلند
یوں اعلان کیا۔ جیسے بھاگا ہُوا بچہ پکڑ آیا ہو۔
ڈورتھی اندر گئی —— سب منتظر رہے —— پھر سب مایوس ہو گئے۔
ڈورتھی نے اپنا ایک کمرہ خالی کر دیا —— بیچ میں سے دروازہ بند ہو گیا۔
"کیا ہو نے سکتا۔ اِدھر بنا پگڑی روم نہیں ملیں گا —— اور حنیف کا بزنس
ڈاؤن ہے —— کاریگر مزدوری بہت مانگتا —— پھر دوپہر کا ٹائم کھانے کا چھٹی مانگتا۔
اکھا دو گھنٹہ کھانا کھاتا رہتا —— اور ادھر کو کام بند رہتا —— ہم استاد بندو کو بولا،
یہ بات گڑبڑ کا ہے۔ وہ بولا کھانا تو مانگتا —— ہم بولا سمجھو، اِدھر ہم کینٹین بناتا۔ دوپہر
کا کھانا ہم دیں گا۔ کھانے کا پیسہ مزدوری میں کٹواؤ —— سب بڑا فیکٹری میں کینٹین ہوتا۔
اب اِدھر ایک روم ہے۔ پن ہم گزارہ کریں گا۔ فیر جب حنیف کا بزنس "لاس" نہیں
کریں گا تو ہم پگڑی پر بڑا فلیٹ لیں گا ——" ڈورتھی نے اپنے ڈرائنگ روم کو سمیٹ کر
کونے میں کر دیا اور پردے کے پیچھے اسپرنگ والے پلنگ کے پاس ٹین جڑی میز پر
بڑے سے دیگچے میں گوشت بگھار کر انگیٹھی دھونکنا شروع کر دی۔
"پن یہ تمہارا سوکن —— اس کو بولو کینٹین کا کام کرے ——" زینب بائی
نے چھیڑا۔
"فوہ! حنیف اس کو کبھی پسند نہیں کیا —— وہ بولتا بہت سست، عورت

ہیں، کچھ حنیف کا خیال نہیں کیا کبھی ــــــ"، ڈورتھی ہاتھ جھٹک کر مطمئن انداز سے بولی۔
شام کو بڑی دیر تک مسٹر ڈگلس انتظار کرتے رہے کہ وائلن چھیڑیں ــــ پھر جب وہ مایوس ہو کر اپنا سفید کوٹ پہنے ایک سیٹھ کے یہاں ٹیوشن کے لئے جانے لگے تو ڈورتھی کے کمرے میں کھٹ کھٹ کی آواز شروع ہو گئی ــــــ مسٹر ڈگلس اچھل پڑے اور کھڑکی کے پاس کھڑے ہو کر وائلن بجانے لگے۔ ونڈرفل! ونڈرفل!! وہ بڑبڑاتے رہے۔
اوپر حنیف کی ماں اس کھٹ کھٹ سے گھبرا کر رضیہ بیگم کے پاس پہنچیں ــــ اور جب اُنھیں پتہ چلا کہ اس کھٹ کھٹ کا مطلب کیا ہے تو اُنھوں نے رونا بین کرنا شروع کر دیا۔
"ارے حنیف کیا گکرم کر رہا ہے ــــ"،
حنیف ماں کو نہ سمجھا سکا۔ اور اسے ڈورتھی سے بات کرنا پڑی۔
"پر مسٹر ڈگلس ہم بولا حنیف ناچنا ہمارا لائف ہے ــــ ہم ناچیں گا اور تم دیکھیں گا اس کے بنا ہم مرجائیں گا۔ ــــ فیر حنیف بولا ڈارلنگ تم ہمارا مدر کو نہیں جانتا۔ اس کر کے تم روز ناچ واسطے مسٹر ڈگلس کے گھر جانا مانگتا ــــــ مے آئی ڈانس ہیر؟
(کیا میں ناچ سکتی ہوں)، ڈورتھی بڑے پیار سے مسکرا کر جھکی۔
ڈورتھی نے ایک کونے میں جا کر گھگھری اور چولی پہنی اور کرسی پر بیٹھ کر حنیف کا انتظار کرنے لگی۔ پھر حنیف سوٹ پہنے ٹائی ہاتھ میں لئے مسٹر ڈگلس کے گھر آگیا ــــ اور ڈورتھی دیوانہ وار ناچتی رہی ــــــ ناچتی رہی۔
فیکٹری میں کام کی دیکھ بھال کے لئے مینجر آگیا۔ یہ حنیف کا سالا تھا ــــ ڈورتھی کو کینٹین چلانے اور سینڈلوں کے نئے ڈیزائن تیار کرنے سے اتنی فرصت نہ ملتی کہ وہ آرڈر بک کرنے اور بل اصول کرنے جا سکتی۔ اس لئے اس کام کے لئے حنیف کے سالے کی رائے سے ایک اینگلو پاکستانی لڑکی کو پارٹ ٹائم ملازم رکھ لیا گیا۔
پھر انھیں دنوں رضیہ بیگم کی بیٹی سے حنیف کے سالے کی شادی کی بات پکّی ہو گئی، ساتھ ہی حنیف کی والدہ کی رائے ہوئی کہ حنیف کی بڑی لڑکی ماشاء اللہ چودہ سال کی ہو گئی ہے اور ماحول اچھا نہیں اس لئے اسے بھی چلتا کیا جائے۔ رضیہ بیگم نے اس سلسلے میں مدد کی اور حنیف کی لڑکی کی بات طے ہو گئی۔

کار و بار پھیلایا جائے تو نفع یوں بھی کم ہوتا ہے، اس پر سے یہ شادیاں آپڑیں۔ حنیف کی لڑکی کا جہیز ایک مسئلہ بن گیا۔

ایک دن وہ بغل میں پوٹلی دبائے ڈورتھی کے کمرے میں آکھڑی ہوئی اور کافی دیر سوچنے کے بعد اسے وہ انگریزی میں لفظ یاد آیا جس سے اسے ڈورتھی کو مخاطب کرنا تھا۔

"فیر ڈارلنگ! بے بی بولا" ممی دیکھو دادی ہم کو شادی واسطے یہ کپڑا دیتا — ہم دیکھا ڈارلنگ! ہم کو بہت شیم ہوا (شرم)۔ تم کچھ کرنا مانگتا ڈارلنگ —" ڈورتھی نے اس رات جہیز کے معاملے میں دخل دینا چاہا۔ مگر حنیف اینٹھ گیا۔

"میں کیا کروں تم خود ہی تو بزنس پھیلوا رہی ہو — میں کچھ نہیں کرسکتا —"

"ایک بات بولیں گا ڈارلنگ۔ تم گسّہ نہیں کریں گا ہم تمہارا دیا ہوا چاروں ساری "بے بی" کو دے دیا۔ اور گولڈن سینڈل بھی۔

اور حنیف نے غصہ کیا — ڈورتھی اسے چومتی رہی، وہ اپنے آپ کو چھڑا کر باہر چلا گیا — یہ اس کے رُکنے کا وقت تھا کیونکہ ڈورتھی اس وقت ڈگلس کے یہاں جاکر ناچتی تھی۔

تب ڈورتھی دھم دھم کرتی کوریڈور سے گزری اور ڈگلس کے یہاں جاکر اتنا ناچی کہ بے دم ہوگئی۔

دونوں شادیاں ہوگئیں — کینٹین چلتی رہی — حنیف کی بیوی کو الٹیاں آنے کی بیماری ہوگئی اس لیے کینٹین کا کھانا ادھر بھی جانے لگا۔

اور پھر ایک رات بلّی کی طرح ایک نوزائیدہ بچّہ ڈورتھی کے دوسرے کمرے میں رویا۔

اُسی دن حلیمہ بائی کا کارندہ ڈورتھی کے دروازے پر آیا کہ کچھ کرائے میں اضافہ کرو — ڈورتھی آج اپنے کمرے سے چولی گھگری پہنے جھیرماں انگلیوں میں پہنے، بغیر کمونو کے باہر آرہی تھی۔

کارندے کے منہ سے کرائے میں اضافے کی بات سُن کر وہ ایک دم ویسی ہی بن گئی، جیسی پانچ سال پہلے اس وقت ہوگئی تھی، جب کارندہ حلیمہ بائی کی طرف سے

اس کے خلاف بدکاری کی شکایت لے کر آیا تھا۔

"کیا بولا کرایہ بڑھائیں گے! ___ ہاں ہمارا کھال کھینچ لو ___" وہ سینہ ابھار کر کولھوں پر ہاتھ رکھے اس کی طرف بڑھی ___ کارندے کی آنکھیں بچ گئیں۔

"کرایہ بولتا ___ ہم بولتا بے ایمان دس سال کا وہائٹ واشنگ اور پینٹ کا پیسہ واپس کریں گا.... بھاگ جاؤ اپنا حلیمہ بائی کو بولو ہمارا پیسہ دیں ___ کیا ہمارے کو دیکھتا ___؟" ڈورتھی نے بُرا سامنہ بنا کر اس کی آنکھوں کے سامنے مجیریاں بجائیں۔

اور کارندے کے منہ میں جو آیا وہ بکنے لگا ___ یہ اچھی باتیں نہ تھیں۔ رضیہ بیگم زینب بائی اور حنیف کی ماں سب اپنے کمروں سے جھانکنے لگیں۔

اور ڈورتھی برابر سے گالیاں بکتی حنیف کو بلانے اُتری۔

مگر فیکٹری کی چابی لئے حنیف کا سالا اوپر آرہا تھا اس نے بتایا حنیف مس ریٹا کے ساتھ آرڈر بک کرنے نکل گیا ہے۔

تب ڈورتھی مسٹر ڈگلس کے کمرے میں گالیاں بکتی گھسی۔

"یو سی مسٹر ڈگلس ___"

مسٹر ڈگلس ساری تفصیل سنتے ہوئے اپنا وائلن رومال سے صاف کرتے رہے۔ اور سر ہلاتے رہے۔

پھر مسٹر ڈگلس نے وائلن پر گز پھیرا۔ ڈورتھی کھڑے سے بیٹھ گئی۔ دُھن بڑھی تو کرسی پر سر ڈال دیا اور ٹانگیں پھیلا دیں۔

مسٹر ڈگلس نے دیکھا اس کی سوکھی ہوئی ٹانگوں پر ہلدی کی چھینٹیں تھیں اور کوئلے کی کالک ___ ان کا گز اور تیز ہو گیا۔

ڈورتھی نے اپنی آنکھیں نیم وا کرلیں اور ہاتھ کرسی کے ہتھے سے گرا دیئے۔ مسٹر ڈگلس نے دیکھا کہ اس کے پالش اڑے ناخنوں میں سوکھا ہوا آٹا بھرا ہوا تھا ___ اور پھر کھن سے مجیریاں فرش پر گر گئیں۔

"آئی ایم ٹائرڈ ___ آئی ایم ویری ٹائرڈ ___" (میں تھک چکی ہوں) ڈورتھی بڑبڑائی اور اس کی آنکھیں بند ہو گئیں ___ مسٹر ڈگلس نے وائلن بکس میں رکھ دیا اور کالی پٹی والا

سفید کوٹ پہن کر ٹیوشن کے لئے چلے گئے ——— پر جانے آج ان کا سر بار بار اسطرح کیوں ہل رہا تھا جس طرح وہ اپنے کسی عزیز کی موت کی خبر پر ہلاتے تھے۔

" رات بھر بلی کی طرح کوریڈور میں پھرتی رہی تھی کمبخت ——— زینب بائی سے کہتی تھی کہ بچہ میں رکھوں گی۔ برقعے والی عورتیں بچوں کو رکھنا نہیں جانتیں ——— ہے نا ذات کی آیا؟ ——— بچے کو اس سے بچا کر رکھنا۔ اے بی اس کا کوئی ٹھیک نہیں۔" رضیہ بیگم حنیف کی ماں کو چپکے چپکے بتا رہی تھیں۔

تب حلیمہ بائی نے اپنے کمرے کی کھڑکی سے رابعہ بائی بلڈنگ پر ایک نظر ڈالی۔ رابعہ بائی بلڈنگ جو انھیں اپنی دادی کی طرح نظر آتی تھی، بوسیدہ زرد میلی ——— پھر اُنھوں نے آنکھیں چیا کر ڈوڑھتی کے کمروں کو پہچاننے کی کوشش کی! ——— نیلا رنگ اڑ چکا تھا ——— شیشے ٹوٹے اور دھنوالے!! ۔

" اچھا تو ڈوڑھتی ایسا بولا ———" اُنھوں نے مڑ کر اپنے کارندے کو دیکھا۔ اور تھک کر بولیں:

" امین بھائی اب اس بلڈنگ کو گرانا ہی پڑیں گا ——— ایک کرایہ دار بھی اچھا نہیں رہا ——— اب ادھر نیا نیا بڑا بڑا فلیٹ بنائیں گا ——— گورا لوگ جتنا کرایہ مانگو دیں گا ———"

••

عزیز اثری



روشنی کی ایک کومل کرن نے ذرا سا پٹ کھول کر باہر جھانکا اور گھپ اندھیرے سے سہم کر پیچھے ہٹ گئی۔ روشنی معدوم ہو گئی۔ اس موقع سے فائدہ اُٹھانے کے لئے کھانسیوں نے طوفانِ بدتمیزی برپا کر دیا۔ ہولے ہولے یہ طوفان تھم گیا۔ جیسے نیند نے جو موت کی چھوٹی بہن ہے۔ سب کے گلے گھونٹ دیئے ہوں۔ فضا چپ چاپ ہو گئی۔ دم سادھ کر یوں بیٹھ گئی۔ جیسے کوئی دوشیزہ سانس روکے ہوئے اپنے محبوب کی منتظر ہے۔

کہیں دور یا نزدیک ایک گھنٹی چیخی۔ ذرا دیر کو رکی۔ پھر چلّانے لگی۔ یوں لگتا تھا جیسے گھنٹی ہچکیاں لے لے کر رو رہی ہے۔ آدھی رات کے سنّاٹے میں، اس ماحول میں یہ آواز پراسرار، مہیب اور دلدوز معلوم ہوتی تھی۔ جیسے اس سہمی، ڈری ہوئی آواز نے موت کے عفریت کو سامنے دیکھ لیا ہو اور اب زندگی سے بچھڑنے کے غم میں نوحہ کناں ہو۔

وہ جو اپر وارڈ سے ملحقہ کمرہ نمبر گیارہ میں بستر پہ پڑا تھا گھنٹی کی آواز سُن کر زیادہ بے قرار ہو گیا۔ بے قرار اور مضطرب، مضطرب اور مایوس، ابھی کچھ دیر پہلے اس نے بھی کھانسیوں کی کانفرنس میں اپنی نمائندہ کھانسی شرکت کیلئے بھیجی تھی۔ کھانسی نے اس کے پورے وجود کو ہلا دیا تھا۔ وہ سینے پہ ہاتھ مار مار کر اس زلزلے سے نجات پانے کی کوشش کر رہا تھا۔ جب کھانسی رکی تو اس کی صدائے بازگشت دیر تک اس کے دل و ذہن میں گونجتی

رہی اور اب پھیپھڑوں میں رہنے والے جراثیم سے زیادہ خطرناک ارادہ اس کے ذہن میں کلبلانے لگا۔ وہ بستر پر اُٹھ بیٹھا۔

وہ کئی روز سے اس ارادے کو پامال کر رہا تھا اور آج شام ہی سے اس نے خود کو پوری طرح تیار کر لیا تھا۔ وہ پلنگ سے نیچے اترا۔ اندھیرے ہی میں بستر سے کمبل اُٹھا کر اپنے گرد لپیٹ لیا۔ آہستہ سے دروازے کی کنڈی کھولی برآمدے میں آکر سراپا سماعت بن کر ہر طرف اندھیرے میں گھورنے لگا۔ گھنٹی کی آواز تھم چکی تھی۔ اس کے بجائے پتھریلے راستہ پر بڑے بڑے بوٹوں کی آواز گونجنے لگی۔ اس نے سوچا کہ شاید کوئی چوکیدار یا کوئی نرسنگ اردلی اس طرف آرہا ہے لیکن آواز دور تھی۔ وہ آہستہ آہستہ احتیاط کے ساتھ چلنے لگا۔ بالکل سانس روکے ہوئے لیکن ایک آواز اسے مسلسل ڈرا رہی تھی۔ یہ اس کے دل کی دھڑکن تھی۔ چاروں طرف اندھیرا تھا۔ سڑکوں پر جلنے والی بتیاں بجھی ہوئی تھیں۔ جیسے فطرت بھی اس کے ارادے کو مکمل کرنے کی سازش میں شریک ہے۔ سردی انتہا پر تھی وہ ٹھٹھر رہا تھا۔ لیکن اس کا ارادہ چٹان کی طرح مضبوط تھا۔ برآمدے سے نکل کر وہ تیز تیز چلنے لگا۔ نیچے چیڑ کے ایک درخت پر ٹارچ کی روشنی تھرکی وہ رک گیا۔ روشنی عین اس کے سامنے ایک بڑے سیاہ پتھر پر پڑی۔ وہ فوراً گلاب کے پودے کے پاس بیٹھ گیا۔ اس نے دیکھا کہ چیڑ کے درخت کی چوٹی کے قریب سے زرد زرد چاند ابھر رہا ہے۔ اس نے سوچا تھوڑی دیر میں چاند نکل آئے گا اور بنا بنایا کام بگڑ جائے گا۔ ابھی تک وہ برآمدے کے پاس ہی تھا۔ ابھی کافی فاصلہ طے کرنا تھا کئی خطروں سے گذر کر جانا تھا۔ اس نے نیچے بیٹھے بیٹھے ٹارچ کی روشنی کے رخ کا تعین کیا پھر اُٹھا اور دبے پاؤں چلنے لگا۔

آپریشن تھیٹر کے پاس سے گذرا ہی تھا کہ اسے قریب ہی کسی کے چلنے کی آواز سنائی دی۔ وہ ڈر گیا۔ رکا اور آواز کو اور بھی قریب ہوتے ہوئے دیکھ کر اپنے کمرے کی طرف پلٹا لیکن قدموں کی آہٹ دور ہو گئی اور اب گانے کی آواز سنائی دینے لگی۔ وہ سمجھ گیا کہ یہ نرسنگ اردلی ہے جو پہاڑی طرز میں سیف الملوک گا رہا ہے۔ وہ مڑا اور پھر اپنے سفر پہ چل پڑا۔ اردلی کا گانا سنتا ہوا۔ اس کی آواز میں کس قدر سوز ہے۔ ہر انسان کے دل میں اتنا بہت سا درد کہاں سے آجاتا ہے؟ انسان کسی نہ کسی درد کسی نہ کسی روگ میں کیوں مبتلا رہتا ہے؟ یہ سوچتا ہوا وہ آپریشن تھیٹر سے گذر کر لیبارٹری تک آگیا۔ یہاں سے دو

راستے جاتے تھے۔ ایک راستے میں اوپر اور نیچے دونوں طرف زنانہ وارڈ تھے۔ ان سے آگے نرسنگ ہوسٹل۔ اصلی راستہ یہی تھا۔ دوسرا راستہ پُرپیچ اور کٹھن تھا۔ چاند اگرچہ نکل آیا تھا اور ہر طرف روشنی پھیل رہی تھی۔ پھر بھی دوسرے راستے پر اوپر چڑھنا آسان نہ تھا۔ ادھر سیدھے راستے پر پکڑے جانے کا خوف تھا لہذا اس نے کٹھن راستہ چنا۔ وہ بڑے پتھر پر پاؤں جما کر چڑھنے ہی لگا تھا کہ اسے یوں لگا جیسے ٹارچ کی بھرپور روشنی سیدھی اس کی پشت پر آ لگی ہے۔ وہ مڑ کر دیکھنے لگا تو آواز آئی۔

"کہاں جا رہے ہو اس وقت؟" آواز میں غصہ بھی تھا اور حیرت کی کیفیت بھی اس کے جسم کو تھرتھری لگ گئی۔ وہ کوئی جواب نہ دے سکا۔ اب ٹارچ کی روشنی اس کے چہرے پر پڑی۔ پھر بجھ گئی۔ آواز اور قریب آ گئی تھی۔

"آپ کہاں جا رہے تھے ـــــ نرسنگ ہوسٹل؟ زنانہ وارڈ؟ یا پھر.....

....." اتنے میں اس نے حواس درست کر لئے۔ تب اسے پتہ چلا کہ یہ نائٹ ڈیوٹی والی نرس ہے۔

"میں ذرا ٹہلنے نکلا تھا۔"

"ٹہلنے؟ آدھی رات کو۔ آپ نئے نئے آئے ہیں نا؟ ـــــ" نرس نے طنز کے ساتھ کہا ـــــ "اس لئے نہیں جانتے کہ ساڑھے آٹھ بجے کے بعد کوئی مریض اپنا بستر نہیں چھوڑ سکتا۔"

"کیوں نہیں چھوڑ سکتا؟ ـــــ" وہ بڑے پتھر پر رکھا ہوا پاؤں نیچے اتارتے ہوئے بولا۔ "یہاں داخل ہونے کا یہ مطلب تو نہیں کہ مریض قید ہو گیا ہے۔"

"تو گویا قید سے رہائی حاصل کر رہے تھے آپ؟"

"ہاں میں رہائی حاصل کر رہا تھا ـــــ میں ـــــ سینی ٹوریم چھوڑ رہا ہوں۔"

نرس گھبرا گئی پھر جلدی سے بولی۔

"آدھی رات کو چوروں کی طرح ـــــ اور اس حالت میں جب کہ آپ کی دونوں کیویٹیز (پھیپھڑوں کے سوراخ) کھلی ہیں۔ آپ رہائی حاصل نہیں کر رہے ہیں مسٹر! اپنی زندگی سے کھیل رہے ہیں جائیے اپنے کمرے میں۔"

"میں کمرے میں نہیں جاؤں گا۔" وہ ضدی بچے کی طرح بولا۔

"دیکھئے اتنی شدید سردی ہے۔ آپ کافی کمزور ہیں۔ اپنی حالت پر ترس کھائیے ورنہ ابھی ایم۔ ایس کو خبر کر دوں گی۔"

"ایم۔ ایس کیا کر لیں گے؟"

"عجیب آدمی ہیں آپ۔" نرس سٹپٹا کر بولی۔ "کیا آپ کو اپنی زندگی سے پیار نہیں؟"

مریض نے کوئی جواب دینے کے بجائے ایک لمبی گہری سانس بھری اور سامنے دیکھنے لگا۔ اوپر چاند نکل آیا تھا۔ اس کی سہانی روشنی ہر طرف پھیل گئی تھی۔ اونچی اونچی پہاڑیوں چیڑ کے درختوں، چھوٹے بڑے پتھروں اور گلاب کے پودوں پر۔ نرس کچھ اور قریب آکر بولی۔

"چلئے نا واپس!"

"میں واپس نہیں جاؤں گا۔ میں یہاں نہیں رہوں گا۔ یہاں ہر طرف موت دکھائی دیتی ہے۔ میں اندھیرے کمرے میں بستر پر ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مرنا نہیں چاہتا۔" اس وقت پتھروں پر بوجھل قدموں کی آواز سنائی دی۔ نرس قدرے نرمی کے ساتھ بولی۔

"دیکھئے، چوکیدار اس طرف آ رہا ہے اگر اس نے آپ کو دیکھ لیا تو فوراً پکڑ کر ڈاکٹر کے پاس لے جائے گا۔"

"ڈاکٹر مجھے ڈسچارج کر دیں گے یہی نا۔" اور وہ اور بھی نرم ہو کر بولی۔

"آپ کے ساتھ میری جواب طلبی بھی تو ہوگی۔ میں نے آپ کی رپورٹ نہیں کی۔ آپ بھی تو کچھ خیال کیجئے۔" مریض نے نرس کی طرف دیکھا۔ اس یخ بستہ چاندنی اور اس ماحول میں نرس اسے اتنی ہی عجیب لگی جتنی عجیب کہ مدقوق شخص کے لٹے پٹے چہرے پر مسکراہٹ ہوتی ہے۔ لیکن مسکراہٹ جہاں کہیں بھی ہو آخر مسکراہٹ ہے اور سیدھی انسان کے دل پر اثر کرتی ہے۔ نرس کی بات نے بھی مریض پر اثر کیا۔ اس نے سوچا کہ یہاں سے بھاگ تو جانا ہی ہے لیکن نرس کو مصیبت میں کیوں ڈالوں۔ اب مجھے لوٹ جانا چاہیئے میں پھر موقع پاکر بھاگ نکلوں گا۔ یہ سوچ کر وہ واپس کمرے کی طرف چلا گیا۔

وہ سردی سے ٹھٹھر رہا تھا لہٰذا جلدی سے اندر جا کر دروازہ بھیڑا۔ اندھیرے ہی میں اوپر لیا ہوا کمبل دوسرے دو کمبلوں کے اوپر ڈال کر ان میں گھس گیا۔ اب ہر جگہ اسے خاصی پرسکون اور گرم محسوس ہوئی۔ اسے سینی ٹوریم میں داخل ہوئے تین ماہ ہو چکے تھے۔ شروع شروع میں اسے یہ جگہ بڑی خوفناک اور ویران لگتی تھی۔ اسے کمرے میں پڑی ہوئی ہر چیز اور

کمرے کی دیواروں تک سے عجیب طرح کی بو آتی تھی۔ جیسے یہاں ہر جگہ ہر چیز میں اسپرٹ، آیوڈین اور دوسری کئی دوائیں رچی بسی ہوئی ہوں۔ کچھ عرصے کے بعد اُس بُو نے اس کے ذہن کے ساتھ دست درازی کرنا بند کر دی۔ لیکن اس وقت کمبلوں میں دبکے ہونے کے باوجود پھر وہی احساس اس پر حملہ کرنے لگا۔ کمرے میں اندھیرا تھا۔ اس کے باوجود اسے بستر کے ساتھ رکھی ہوئی تھوک دانی دکھائی دے رہی تھی۔ آج صبح ہی اس نے تھوکدانی میں اپنا خون دیکھا تھا۔ اور تھوڑی دیر پہلے جب اس نے سینے پر ہاتھ مار مار کر کھانسی کے طوفان کو روکا تھا وہ برابر سوچ رہا تھا کہ اسے پھر تھوک میں خون آ رہا ہوگا۔ کھانسی کا دورہ جتنا طویل ہوتا تھا اتنا ہی خون تھوکنے کا وہم مضبوط ہوتا تھا۔ پھر کسی وارڈ میں گھنٹی چیخی۔ اسے گھنٹی کی آواز یوں لگی جیسے رات کی ویرانی میں کتّا رو رہا ہو۔ کتّے کی یہ منحوس آواز تباہی اور موت کا احساس دلاتی ہے۔ اس نے سوچا یہ ماحول بھی بالکل ویران سرد اور خوفناک ہے۔ گھنٹی کی آواز اس بات کا پتہ دیتی ہے کہ کسی مریض کی حالت خراب ہے۔ ایک مریض موت کی طرف رینگ رہا ہے۔ یہاں موت ہی کا راج ہے۔ موت میرے قریب ہی اس تھوک دانی میں چھپی بیٹھی ہے۔ یہ مجھے غافل پا کر شب خوں مارے گی۔ وہ بستر پر اُٹھ بیٹھا۔ دروازے پر ہلکی سی دستک ہوئی اور نرس کمرے میں داخل ہوئی۔ آتے ہی ٹارچ چلائی۔ روشنی مریض پر پڑی وہ پھر لیٹ گیا۔ وہ آتے ہی بولی۔

"میرا خیال تھا کہ آپ جاگ رہے ہوں گے۔ ایسے خطرناک مریضوں کو نیند کم آتی ہے۔"

دو تین لمحے خاموشی رہی۔

"مجھے آپ خطرناک سمجھتی ہیں؟" نرس نے جو دیوار پر ٹارچ کی روشنی میں سوئچ تلاش کر رہی تھی بلب جلا دیا۔ سارا کمرہ روشنی سے معمور ہو گیا۔ نرس مریض کی آنکھوں میں گھورتی ہوئی بولی۔

"یہ تو آج ہی پتہ چلا ہے کہ آپ اس قدر خطرناک ہیں۔ لیکن اس کے باوجود آپ کو یہاں رہنا چاہئے۔"

"میں یہاں نہیں رہ سکتا ——" وہ اکتائے ہوئے مگر درد بھرے لہجے میں بولا۔

"میں یہاں نہیں رہ سکتا۔ میں بھری پُری دنیا میں لوٹ جانا چاہتا ہوں۔" نرس کرسی پر بیٹھ کر اونی مفلر اپنے گلے کے گرد لپیٹتے ہوئے بولی۔

"آپ یہ بھول رہے ہیں مسٹر! کہ اسی بھری پری دنیا نے آپ کو یہ بیماری بخشی ہے۔"

"ٹھیک ہے۔" وہ بولا —— "لیکن میں یہاں رہ کر ٹھیک نہیں ہو سکتا۔"

"یہ آپ سے کس نے کہا ہے؟" نرس نے جلدی سے اور قدرے تلخی کیساتھ پوچھا۔

"کسی نے نہیں کہا۔ لیکن میں جانتا ہوں کہ موت میری طرف بڑھ رہی ہے اور جب مرنا ہی ہے تو یہاں قید میں مرنے کے بجائے چمکتی دمکتی ہوئی دنیا میں پر رونق سڑک پر ہنستے کھیلتے ہوئے کیوں نہ مروں؟" نرس مریض کی گفت شنید سے اتنی متاثر ہوئی کہ چپ ہو گئی۔ دو تین لمحوں تک مسلسل اسے گھورتی رہی پھر اس کی نظریں جھک کر چھوٹے میز پر پڑے ہوئے مریض کے چارٹ پر گڑ گئیں۔ جہاں مریض کا درجۂ حرارت، نبض کی رفتار، وزن، غذا، طرح طرح کی دوائیں اور ٹیکے وغیرہ لکھے تھے۔ وہ سوچنے لگی کہ یہ مریض دوسرے مریضوں سے کس قدر مختلف ہے۔ یہ زندگی سے مایوس نہیں۔ یہ موت سے بھی نہیں ڈرتا۔ صرف سینی ٹوریم کے اجاڑ ماحول سے، تنہائی سے ڈرتا ہے۔ کچھ دیر تک وہ سوچتی رہی پھر بولی۔

"دیکھئے! مریض تو یہاں رہنے کے بعد واپس گھر جانے کے لئے رضامند ہی نہیں ہوتے۔ اپنی صحت کو بحال کرنے کیلئے زیادہ سے زیادہ یہاں رہنے کا لالچ کرتے ہیں اور آپ ہیں کہ یہاں سے چوری سے بھاگ جانا چاہتے ہیں۔"

"تو مجھے آپ ویسے چھٹی دلوا دیجئے۔" اور مریض پہلی بار مسکرایا۔

"آپ عجیب آدمی ہیں۔" نرس بولی۔ پھر لہجے کو انتہائی نرم کر کے بولی ——

"اپنے ساتھ دشمنی نہ کیجئے۔ آپ اس حالت میں گھر جائیں گے تو آپ کے ماں باپ، بھائی بہنوں اور دوستوں کو بھی خطرہ رہے گا۔ آپ ہر جگہ اپنے جراثیم بانٹتے پھریں گے اس کے برعکس یہاں رہ کر جلد اچھے ہو جائیں گے۔ اگر آپ کو اپنے آپ پر رحم نہیں آتا تو اپنے گھر والوں، عزیز و اقارب کی زندگی کی خاطر ہی یہاں رہ جائیے۔" وہ کچھ نہیں بولا۔ یوں لگتا تھا جیسے وہ نرس کی باتوں کو دل ہی دل میں تول رہا ہے۔ پھر بولا

—— "میں گھر نہیں جانا چاہتا۔ صرف یہاں سے بھاگ جانا چاہتا ہوں۔ یہاں ہر طرف زندہ لاشوں کے ڈھیر لگے ہیں۔ یہاں کھانسیوں اور خون بھری تھوکوں کے سوا کچھ نہیں۔"

"کیوں؟ ڈاکٹر، نرسیں، اردلی، کمپاونڈر اور مہتر وغیرہ بھی تو ہیں۔" نرس نے شوخ لہجے میں کہا۔

"یہ لوگ یہاں ہوتے ہوئے یہاں نہیں ہوتے۔" وہ بیزاری سے بولا۔ "یہ صرف تنخواہیں وصول کرنے کے لئے مجبوراً ہمارے پاس آتے ہیں۔ دراصل یہ سب ہم سے ڈرتے ہیں، ہم سے نفرت کرتے ہیں۔"

"آپ کا اندازہ غلط ہے ——" وہ جلدی سے بولی۔ "کوئی ڈاکٹر، کوئی نرس عملے کا کوئی فرد آپ سے نفرت نہیں کرتا۔ سب کو آپ کے ساتھ ہمدردی ہے۔"

"کسی کو نہیں۔" وہ بولا۔ پھر رک گیا اور کہا۔ "سوائے ایک نرس کے۔" یہ کہہ کر وہ شرارت سے یا شاید طنز کے ساتھ مسکرا دیا۔ نرس اس کی شرارت یا طنز کو نظر انداز کرتے ہوئے بولی۔ "میرا تجربہ تو یہ کہتا ہے کہ جو شخص اس حالت میں بھی مسکرا سکتا ہے وہ کبھی نہیں مر سکتا۔ آپ صرف تنہائی سے اکتائے ہوئے ہیں۔ ہم کوشش کریں گے کہ آپ کو اس احساس سے نجات دلائیں۔ آپ کے علاج کے لئے یہ ضروری ہے۔"

"میرے ساتھ علاج کی بات نہ کیجئے۔ مجھے یہ کاروباری انداز زہر لگتا ہے۔" مریض نے تلخی کے ساتھ کہا۔

"اور ہم کوشش کریں گے" "ہم" سے آپ کی کیا مراد ہے؟"

"ہم سے میری مراد ہے۔" نرس اسے سمجھانے لگی پھر ارادہ بدل کر بولی "ہم" سے مراد ہے "میں" وہ مریض کو دیکھتے ہوئے مسکرائی۔ مریض کو باہر یخ بستہ چاندنی میں نرس کی مسکراہٹ جتنی عجیب سی لگی تھی اب بلب کی روشنی میں اتنی ہی دلآویز معلوم ہوئی۔ نرس کے پتلے پتلے ہونٹوں پر یہ مسکراہٹ اتنی حسین تھی کہ مریض کا دل چاہا کہ ان ہونٹوں پر بے اختیار اپنے ہونٹ رکھ دے۔ ایک جھٹکے کی طرح یہ خیال پھر اپنے آپ کو کچلا گیا۔ وہ لرز اٹھا۔ "تو تپ دق کا مریض ہے تیرے سانس تک میں جراثیم پل رہے ہیں دیکھتا نہیں کہ لوگ مجھ سے دور رہ کر بات کرتے ہوئے بھی ناک اور منہ پر رومال رکھ لیتے ہیں۔" اس کے سینے میں ایک لمبی آہ رینگی جس نے اسے بمشکل دبایا۔ نرس کہہ رہی تھی۔

"میں ڈیوٹی کے بعد بھی آپ کے پاس آیا کروں گی۔ آپ کی تنہائی کو دور

کروں گی لیکن وعدہ کیجیے کہ اب آپ بھاگیں گے نہیں ——— نہیں بھاگیں گے نا!"
نرس کا لہجہ اس قدر میٹھا تھا کہ مریض نے وعدہ کر لیا۔

مریض سینی ٹوریم سے نہیں بھاگا۔ اور نرس نے بھی وعدہ پورا کیا۔ وہ مریض کی طرف توجہ دینے لگی۔ پہلے وہ کمرہ نمبر گیارہ میں نرسنگ اردلی ہی کو بھیج دیا کرتی تھی۔ اب خود آنے لگی۔ مسکراتی ہوئی کمرے میں داخل ہوتی اور کوئی نہ کوئی پیارا سا فقرہ چست کر دیتی۔ مریض کی رفتار نبض دیکھتے ہوئے اس کا وزن کرتے ہوئے، انجکشن لگاتے، دوا پلاتے وقت، وہ مریض کے مخصوص مزاج کو پیش نظر رکھتی۔ وہ کوشش کرتی کہ مریض اداس اور مایوس ہونے کے بجائے خوش خوش رہے۔ نرس کو مطالعے کا شوق بھی تھا لہٰذا اس کے پاس کئی ناول اور رسالے موجود تھے۔ وہ انھیں مریض کیلئے لے آتی۔ لائبریری سے بھی کتابیں نکلوا کر اسے پڑھنے کو دیتی اپنا گراموفون یا ہوسٹل سے ریڈیو بھی کبھی کبھی لے آتی۔ اور مریض کو گانے سنواتی۔ اپروارڈ سے اس کی ڈیوٹی کہیں اور تبدیلی ہو جاتی تو بھی ڈیوٹی سے فارغ ہوتے ہی گیارہ نمبر میں آجاتی۔ اسے پوری طرح احساس تھا کہ مریض کی روح اتنی دکھی ہے کہ اگر اسے ذرا بھی تنہا چھوڑ دیا گیا تو یہ روح بھٹک بھٹک کر فنا ہو جائے گی۔

غیر متوقع طور پر ایک دم سے کھانا پکا کر جو حالت ایک بھوکے شخص کی ہوتی ہے بالکل وہی حالت مریض کی ہو گئی۔ اس نے نرس کی اس قدر توجہ اور شفقت پائی تو ہر طرف سے دھیان ہٹا کر صرف اسی کے ساتھ وابستہ ہو گیا۔ وہ اب دن بھر اس کا منتظر رہنے لگا۔ کمرے کے برآمدے میں ہلکے قدموں کی چاپ سنائی دیتی تو مریض کا دل دھڑک اٹھتا۔ اب اس کی صحت بحال ہونے لگی۔ وزن بڑھ گیا۔ بھوک بڑھ گئی۔ سینی ٹوریم میں اس کا دل لگ گیا۔ اب اسے یہ جگہ اجاڑ، ویران اور موت آثار نہیں لگتی تھی۔ اب اس میں زندگی کی لہر دوڑ گئی تھی۔ ماحول کے اس اندھیرے میں نرس کی دلآویز مسکراہٹ دمک رہی تھی۔

نرس نے جو رشتہ انسانی شفقت کی حد تک کمرہ نمبر گیارہ کے مریض کے ساتھ قائم کیا تھا۔ وہ اسے اپنے خواب و خیال میں کافی دور تک لے گیا۔ نرس کے ہمدردانہ رویئے میں جس قدر توازن تھا مریض کے جذبات اتنے ہی غیر متوازن اور تیز رفتار تھے

اس قدر تیز رفتار کہ مریض اپنی بیماری جیسی سنگین حقیقت کو بھول بیٹھا۔ نرس کے بستر کے قریب آتے ہی وہ اس کی طرف ہاتھ بڑھا دیتا۔ اور اس کا گدگدا ننھا سا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر بے حد تسکین محسوس کرتا۔ وہ مسکراتی ہوئی آہستہ سے اپنا ہاتھ اس کے ہاتھ سے پھسلا لیتی اور کرسی پر بیٹھ کر باتیں کرنے لگتی۔ تب مریض کی نظریں اس کے گلابی، مہین ہونٹوں پر گڑ جاتیں۔ اس کے سارے دلی جذبات کھنچ کر نظروں میں آجاتے۔ مریض نرس کے جتنا قریب آرہا تھا اتنی ہی اس کے ہونٹ چومنے کی خواہش مریض کے دل میں بڑھ رہی تھی۔ وہ چاہتا تھا کہ صرف ایک بار اپنے تپتے ہوئے ہونٹ ان ہونٹوں پر رکھ دے اور پھر ہمیشہ کے لئے مطمئن ہو جائے۔

لیکن وہ تربیت یافتہ اسٹاف نرس تھی۔ مریض کی بیماری کے اونچ نیچ سے اچھی طرح واقف تھی۔ وہ جانتی تھی کہ مریض کی حالت اگرچہ قدرے سدھر رہی ہے پھر بھی اس کے جراثیم بڑے مہلک ہیں جو سانس کے ذریعہ کسی بھی تندرست شخص میں داخل ہو کر اسے موذی مرض میں گرفتار کر سکتے ہیں۔ نرس کے سارے انس کی بنیاد صرف ہمدردی۔ اس میں کسی طرح کے جذبات کا اندھا پن شامل نہیں تھا۔ مریض جذبات کی رو میں بہہ رہا تھا۔ حالانکہ اس نے کئی بار خود کو سمجھایا تھا کہ نرس کے قریب ہونے کی خواہش کرنا نادانی ہے۔ اسے اپنی احمقانہ خواہش پر کئی بار غصہ آیا تھا۔ اس نے کئی بار خود کو یاد دلایا کہ اس رات کو وہ نرس کے ہونٹوں کا تصور کر کے بھی کانپ اٹھا تھا۔ لیکن اس کی کوئی سوچ اس کے جذبات کی رفتار کو کم نہ کر سکی یوں لگتا تھا جیسے اس کی جذباتی زندگی کا سارا دارو مدار صرف نرس سے محبت کرنے پر ہے۔

ایک روز نرس کمرے میں داخل ہوئی۔ اس وقت وہ بستر کی بجائے آرام کرسی پر نیم دراز تھا۔ اس نے حسب معمول نرس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ وہ اپنا ہاتھ ہولے سے کھسکانے لگی تو اس کا ہاتھ چھوڑنے کے بجائے اس پر اپنے ہونٹ رکھ دیئے۔ یہ سب کچھ اتنی جلدی ہوا کہ نرس بھونچکا سی رہ گئی۔ مریض نے اس کی طرف دیکھا وہ بے حد سہمی ہوئی تھی۔ وہ چپ چاپ دوسری کرسی پر بیٹھ گئی۔ نرس کو آج اندازہ ہوا کہ اس کی ہمدردی اور محبت اسے اتنی دور تک لے آئی ہے کہ یہاں سے خطرے کی سرحد شروع ہو چکی ہے۔

"معلوم ہوتا ہے تم ڈر گئی ہو؟"۔ مریض کچھ روٹھے ہوئے انداز میں بولا۔

"نہیں تو" وہ دروازے سے باہر دیکھتے ہوئے بولی اور دل میں سوچنے لگی: "میں نے تمھاری تنہائی دور کرنے کا کرنے کا وعدہ کیا تھا۔ اس کے بدلے میں اپنی زندگی دینے کا

پیمان تو نہیں کیا تھا!" لیکن وہ منہ سے کچھ نہ بولی۔ بت بنی بیٹھی رہی اور اس کی خاموشی اور ہٹی ہٹی نظریں دیکھ کر مریض کو دکھ ہوا۔

"ناراض ہو گئی ہو؟" وہ نہیں بولی۔ پھر سوچنے لگی کہ اس کی خاموشی اور بے رخی مریض کے لئے اذیت ناک ثابت ہو گی۔ وہ بولی "میں ناراض نہیں ہوں ــــــ میں ناراض کیوں ہونے لگی!" وہ زبردستی مسکرائی اور مریض نے سوچا کاش آج ہاتھ کی جگہ اس کے پھول کی پتیوں ایسے ہونٹ ہوتے۔

وہ پہلے کی طرح اب بھی اس کے پاس آتی، باتیں کرتی، ہنستی ہنساتی لیکن محتاط ضرور ہو گئی تھی۔ وہ مریض کے زیادہ قریب جانے سے کتراتی اور اس سے اپنا ہاتھ بچانے کے لئے طرح طرح کی تجویزیں سوچتی۔ کبھی بغیر ضرورت کے دونوں ہاتھوں میں انجکشن کی ٹرے اٹھائے آتی کبھی بڑی بڑی بوتلیں یا دوا کی گولیاں لئے ہوئے۔ اب وہ سوچ سوچ کر باتیں کرتی۔ کسی دوسری نرس کا اصلی یا فرضی واقعہ سناتی کہ کس طرح فلاں نرس نے فلاں مریض سے محبت کی تھی۔ دونوں جذبات کا شکار ہو گئے۔ آخر مریض تو ٹھیک ہو گیا لیکن نرس بیمار پڑ گئی۔ اور پھر موت کا نشانہ بن گئی۔" وہ اکثر گفتگو کا رخ اس طرف پھیر دیتی۔ مریض بظاہر چپ رہتا لیکن اندر ہی اندر کھولنے لگتا۔ وہ تنہائی میں کئی بار خود کو سمجھاتا۔ وہ محبت میں اس قدر خودغرض ہو جانے پر خود کو ملامت کرتا۔ لیکن فوراً ہی یہ سب کچھ ذہن سے ڈھل جاتا۔ وہ نرس سے جتنی محبت کرتا اتنا ہی مریض ہوتا جا رہا تھا۔ نرس کے گریز نے جلتی آگ پر تیل کا کام کیا۔ اس کے جذبات بھڑک اٹھے۔

ایک شام کو نرس اپنے ہوسٹل سے اس کیلئے کھانا لے کر آئی۔

"ہمارے ہوسٹل میں آج دعوت تھی میں نے سوچا کہ خود کھانے سے پہلے تمھیں کھلا دوں!" مریض کا دل خوشی سے ناچ اٹھا۔

"تمھارے برتن کہاں ہیں؟" اور اس کا جواب سنے بغیر نرس ڈولی کی طرف گئی۔ مریض [illegible] جو برتن نکال کر ان میں کھانا الٹنے لگی۔ مریض کی خوشی پر جیسے کسی نے کلہاڑا دے مارا۔ [illegible] نے سوچا کہ نرس کھانا لے کر آئی ہے اب میرے برتنوں میں ڈال رہی ہے کہ کہیں میں اس کے برتنوں کو ہاتھ نہ لگا دوں۔ یہ مجھے اچھوت سمجھتی ہے۔ مجھ سے نفرت کرتی ہے وہ بولا "میں کھانا نہیں کھاؤں گا!"

"کیوں نہیں کھاؤ گے؟" نرس اس کے لہجے کی تلخی بھانپ گئی تھی۔
"میں کھا چکا ہوں۔"
"جھوٹ —" وہ مسکرا کر بولی — "مسٹر ابھی تو تمھارا کھانا آیا بھی نہیں ہے اس لئے جلدی سے آئی ہوں کہ کہیں تم کھا نہ چکو۔"
"میں نہیں کھاؤں گا۔"
"آخر کیوں؟" وہ مڑ کر بولی۔
"تم مجھے اچھوت سمجھتی ہو۔ مجھ سے نفرت کرتی ہو۔" وہ پھٹ پڑا۔ اپنے برتن وہیں ڈولی پر چھوڑ کر اس کی طرف آئی اور بستر کے قریب رک کر بولی۔
"پاگل تو نہیں ہو گئے ہو؟"
"تم نے مجھے پاگل کر دیا ہے۔" وہ چیخا۔ "پہلے محبت جتاتی ہو پھر نفرت کرتی ہو۔ تم کھانا صرف اس لئے لے کر آئی ہو کہ مجھے پنچ اور اچھوت ہونے کا احساس دلا سکو۔ میری عزت نفس کو گالی دے سکو......" اور غم و غصہ کے جوش میں اس پر کھانسی کا دورہ پڑ گیا۔ اتنے میں کھانا بانٹنے والے وارڈ بوائز آ گئے۔ مریض نے کھانسی روک کر کہا۔
"لے جاؤ — میں نہیں کھاؤں گا۔"
"کھاؤنا باؤجی۔" دونوں وارڈ بوائز نے ایک زبان ہو کر کہا۔ پھر ایک نے ڈولی پر پہلے سے رکھا ہوا کھانا دیکھ کر سالن کی بالٹی اٹھا کر چلنے لگا دوسرے نے بھی اس کا ساتھ دیا۔
"اب تو کھالو کھانا۔" نرس نے بڑی نرمی کے ساتھ کہا۔
"لے جاؤ اسے ورنہ میں باہر پھینک دونگا۔" نرس کو وہ بدستور کھڑے دیکھ کر وہ گرجا۔ "چلی جاؤ میں تنہا رہنا چاہتا ہوں۔ بالکل تنہا۔" نرس نے آج پہلی بار مریض کو اس قدر برہم دیکھا تھا۔ اسے اپنی توہین کا بڑا دکھ ہوا۔ وہ چلی گئی۔ مریض نے یہ نہیں دیکھا کہ نرس واقعی چلی گئی یا کھڑی ہے وہ کروٹ بدل کر پھوٹ پھوٹ کر رو رہا تھا۔
مریض کی صحت کی بحالی کی رفتار کم ہو گئی۔ اب وہ دن رات ذہنی الجھن میں مبتلا رہتا تھا۔ پریشانی کی حالت میں سوچتا کہ اب کوئی شخص اس کے قریب نہیں پھٹکے گا۔ سبھی اس سے نفرت کرتے ہیں۔ نرس جس سے وہ اس قدر محبت کرتا ہے اس سے دور بھاگتی ہے۔ نرس کے رویے نے ثابت کر دیا کہ وہ خطرناک حد تک

بیمار ہے۔ اس روز ڈاکٹر نے بھی بتایا تھا کہ اس کا تھوک ابھی پازیٹو (مثبت) ہے۔ یہ سوچ سوچ کر اسے بے بسی، بے چارگی اور مایوسی کا احساس ہونے لگا۔ لیکن وہ جتنی بے چارگی اور مایوسی محسوس کرتا اتنا ہی نرس کے قریب ہونا چاہتا۔ نرس اب ہر وقت خود آنے کے بجائے کبھی کبھی نرسنگ اردلی کو انجکشن لگانے یا دوا پلانے کے لئے بھیج دیتی۔ مریض کمرے میں نرسنگ اردلی کو دیکھتے ہی آگ بگولا ہو جاتا۔ وہ انجکشن لینے سے انکار کر دیتا۔ نرس کے کم آنے کی وجہ مریض سے خوف ہی نہ تھا بلکہ اس کا باعث یہ بھی تھا کہ اب مریض نرس کے گریز کا انتقام لینے کے لئے اس پر چبھتے ہوئے جملے کستا۔ اسے طعنے دیتا۔ وہ نہ آتی تو وہ جلتا کڑھتا رہتا وہ آجاتی تو تلخ باتیں کرنے لگتا۔ اس سے نرس اور بھی پریشان ہو جاتی اس کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ آخر اس مریض کا کیا کرے۔

آج اس کی نائٹ ڈیوٹی کی پہلی رات تھی۔ وہ اس کے پاس آکر بولی۔

"تم اتنے پریشان کیوں رہتے ہو؟"

"تمھیں اس سے کیا" مریض نے روکھا سا جواب دے کر نظریں پھیر لیں۔

"مجھے نہیں بتاؤ گے؟ دیکھو مسٹر! اتنے پریشان رہو گے تو پھر حالت خراب ہو جائے گی" وہ کچھ نہیں بولا۔ نرس نے کہا ——

"تمھیں آخر ہو کیا گیا ہے؟ میری طرف دیکھتے بھی نہیں ہو!"

"تمھاری طرف اس لئے دیکھوں کہ تمھاری نظروں میں اپنے لئے نفرت پڑھ سکوں"

"میں تمھیں کیسے یقین دلاؤں کہ میں تم سے نفرت نہیں کرتی"

"اب اور کیا یقین دلاؤ گی؟ ——" وہ بولا —— "اس روز ذرا سا ہاتھ چوم لیا تو یوں کانپ اٹھیں جیسے سانپ نے ڈس لیا ہو۔ پھر کھانا لائیں تو اپنے برتنوں کو ہاتھ تک نہ لگانے دیا۔ اب کس لئے آئی ہو۔ اب کیا چاہتی ہو؟"

"میں یہی چاہتی ہوں کہ تم بہت جلد ٹھیک ہو جاؤ۔ اگلے پیر کو تمھارا فرینک (آپریشن) ہو گا اب تمھیں پریشان نہیں رہنا چاہئے۔ لو یہ دوا پی لو"

"لے جاؤ اپنی دوائیں مجھے ان کی ضرورت نہیں۔ ان سے میرا علاج نہیں ہو سکتا"

نرس نے اور بھی نرمی اور پیار کے ساتھ پوچھا: "تو اور کس سے ہو سکتا ہے؟
وہ چپ رہا جیسے کوئی بوجھ سر سے پٹک دینے کے لئے سوچ رہا۔ پھر اچانک نرس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر خوفناک طریق سے بولا۔
"تمھارے ان ہونٹوں سے!" نرس خوفزدہ ہو کر کرسی کے پشت کے ساتھ آلگی۔ وہ سر سے لے کر پاؤں تک لرزنے لگی۔ مریض اسے برابر گھور رہا تھا جیسے دو ٹوک جواب چاہتا ہو۔
"میں نے تمھاری اتنی خدمت کی ہے۔" کچھ دیر کے بعد وہ ہولے سے بولی۔
"میں تمھیں موت سے بچانا چاہتی ہوں اور تم مجھے مار ڈالنا چاہتے ہو۔ کیا میری......" اور نرس کا گلا رندھ گیا۔ خوف کی جگہ گہرے رنج نے لے لی۔ اس کی آنکھوں میں آنسو تیرنے لگے۔
"بڑی مکّار ہو تم۔ آنسو دکھا کر مجھے ڈرانا چاہتی ہو — جاؤ یہاں سے —" نرس نے آنسو پونچھ دیئے اور دہلی ہوئی آنکھوں سے روشن بلب کو گھورنے لگی پھر بولی۔
"اچھا دوا تو پی لو مجھے وارڈ میں جا کر بھی دوا پلانی ہے۔"
"جاؤ وارڈ میں — یہاں کیا لینے آئی ہو؟ آئندہ یہاں قدم رکھا تو میں....."
"میں تو یہاں آؤں گی تم کیا کر لو گے؟ —" وہ مسکرائی۔
"میں یہاں سے بھاگ جاؤں گا۔ سمجھیں؟" وہ غصّے میں پھنکتا ہوا بولا —
"اٹھو — جاؤ میں کہتا ہوں۔" اسے وہیں بیٹھے دیکھ کر مریض کا غصہ ناقابلِ برداشت ہو گیا۔ "نہیں جاتی ہو؟ — لو میں جا رہا ہوں — ابھی جا رہا ہوں۔ دیکھوں مجھے کیسے روکتی ہو!" وہ تینوں کمبل پھینک کر اٹھنے لگا لیکن فوراً ہی شدید کھانسی نے اسے بے حال کر دیا۔ وہ کھانسنے اور تھوکنے لگا۔ پھر اس نے تھوک دانی میں دیکھا اور بمشکل کھانسی کو ضبط کر کے بولا۔
"لو دیکھو مجھے پھر خون آنے لگا ہے۔ اب تو خوش ہونا۔ اب تو مجھے مرنے سے نہیں روکو گی۔" وہ پھر کھانسنے لگا۔ نرس بے حد گھبرا گئی۔ اسی گھبراہٹ میں دروازہ کھول کر باہر نکلی اور نرسنگ اردلی کو پکارنے لگی۔ لیکن آواز اس کے سوکھے ہوئے

حلق ہیں اٹک کر رہ گئی۔ وہ اسی حالت میں واپس کمرے میں آئی۔ مریض کا مارے کھانسی کے دم نکلا جا رہا تھا۔ اس کے ہونٹوں کے کونے پر خون کا چھینٹا چپکا ہوا تھا۔

"ہاں میں مر رہا ہوں ___ کاش ___ میرا ___ میرا کوئی اپنا یہاں ہوتا ___" نرس کے دل میں جیسے بارود سا پھٹا۔ وہ بے اختیار ہو کر اس کے بستر کی طرف کھنچی۔ اور اس کے ہونٹوں کے کونے پر لگا ہوا خون کا چھینٹا انگلی سے پونچھنے لگی۔

"اُٹھو یہاں سے" وہ کھانسی روک کر نحیف آواز میں بولا اور لاغر ہاتھوں کے ساتھ نرس کو بستر سے اٹھانے لگا ___ "جاؤ ___ تم مجھ سے نفرت......"

"میں تم سے نفرت نہیں محبت کرتی ہوں" وہ بولی اور اس کے ماتھے سے بال ہٹانے لگی۔

"میرے قریب مت آؤ ___ میرے جراثیم ___" وہ نہیں اٹھی۔ ___ اس پر زیادہ جھک گئی۔

"اٹھو ___ اٹھو......" اس سے آگے وہ کچھ نہ کہہ سکا۔ وہ گلابی پتلے ہونٹ اس کے ہونٹوں پر گڑ چکے تھے۔

رفعت بلخی



اُسے پھر نیند نہ آئی۔ ساون برسا اور پچھلی رات کو ہوا بھی تھوڑی سرد ہوئی۔ مگر جالبؔ جوں کا توں اپنے بوسیدہ پلنگ پر پڑا آنکھیں چھت پر جمائے خود کو کوستا رہا۔ وہ ایک مدت سے بیمار تھا۔ بیماری کے ان چار سالوں میں اُسے محسوس ہو جیسے اُس کے کمرے کی تمام چیزیں بیمار ہیں۔ وہ بیمار ہے۔ اُس کا پلنگ بیمار ہے اس کی چھت اور کمرے کی دیواریں بیمار ہیں۔ اور بیمار ہے وہ دریچہ جس کی زنگ آلود سلاخوں سے ہر موسم کا چاند اُسے یوں گھورتا ہے جیسے اپنی شادی سے قبل اُسے کالج آتے جاتے بس سے دیکھا کرتی تھی ___ ہائے اس کی وہ آنکھیں ___ اُسے آج تک یاد ہیں وہ آنکھیں جیسے کسی مقدس محراب کے دیئے روشن ہوں۔ مگر وہ آنکھیں بھی شاید اب دریچہ ویران کر گئی ہوں گی ___ کون کس کا انتظار کرتا ہے ___؟ اس پر مایوسی کا کہرسا چھا گیا اور اس نے کرب آلود کروٹ لی۔ پرانے پلنگ کی رندھی ہوئی آواز نے اُسے بہت اُداس کر رکھا تھا۔ ڈاکٹروں کی رائے اور گھر کے لوگوں کی ضد کے باوجود وہ اپنے پلنگ کو ہٹانے کے حق میں نہ تھا۔ نیم جاں پلنگ اور بے جان جالبؔ کے بیچ کا یہ جذباتی حصہ روز بروز پراسرار اور گہرا ہوتا جا رہا تھا۔ سچ تو یہ ہے کہ اُس لگاؤ کو اُس کی بیوی زیباؔ بھی منقطع نہ کر سکی ___ اور اب ان تینوں یعنی پلنگ جالبؔ اور زیباؔ میں بہت سی باتیں مشترک ہو چلی تھیں۔

زیباؔ جالبؔ کی شریکِ حیات سے زیادہ اب شریکِ غم بن گئی تھی۔ شاید اُس کا غم قدرے گھٹتا اگر اُس کے پاؤں زینے پر بھرپور جمتے اور ایک شام وہ

جالبؔ کو بیہوش پڑوسیوں کے کندھے پر اس طرح اچانک نہ دیکھتی جیسے کوئی ہمیشہ کے لئے گھر چھوڑ جاتا ہے۔ اور پھر کوئی سورج گھر کو روشنی نہیں بخش پاتا۔ اُف کس قدر منحوس اور اندھیرا آسمان تھا کہ نہ کوئی چاند تھا اور نہ کوئی سورج اُس کے سر سے بہتا ہوا خون چہرے پر باسی لکیریں بن کر خشک ہو گیا تھا اور جس کی چاکلیٹی چمک پر مکھیاں منڈلا رہی تھیں۔

جالبؔ ندی میں غسل کرتے ہوئے ایک چٹان سے کچھ اس طرح ٹکرا گیا تھا کہ جسم کا سارا بوجھ سر پر آ رہا اور ریڑھ کی ہڈیاں نمک کھائی ہوئی دیوار کی اینٹوں سے طرح بیٹھ گئیں۔ گھر میں کہرام مچ گیا۔ خبر محلے محلے گشت کر گئی اور زیباؔ جو اُمید سے تھی کچھ اس طرح نا امید ہوئی کہ آج تک اُس کا غم کم نہ ہوا اور اب تو اُس کے سینے کی جلن کچھ اس طرح بجھ گئی تھی جیسے وہ کبھی اُمید سے ہوئی ہی نہ ہو۔

سرجکل وارڈ کا اندرونی حصہ زیادہ کشادہ نہ تھا۔ اُس کی دیواریں نصف حصے تک سیاہ تھیں اور باقی حصے چھت تک سفید تھے۔ بیڈ نمبر ۱۲ کونے سے قریب تھا۔ اور جس کے اوپر چھت سے لگی ایک بتی جھولتی تھی جس پر گرد آلود پرانا شیڈ پڑا تھا۔ تین دنوں کی لگاتار کوششوں کے بعد جب جالبؔ کی بیہوشی ختم ہوئی تو اُس نے سر پر وہی چھت والی بتی جھولتی دیکھی جس کی چمک نے سر میں بوجھ سا پیدا کر رکھا تھا۔ اس کا سارا جسم سرد تھا اور جب اُس نے گھبراہٹ میں کروٹ بدلنا چاہا تو خود کو اُسی طرح پتھر میں پھنسا ہوا پایا۔ جیسے وہ سنگ تہہ آب ہو کر رہ گیا ہو۔ اپنی تمام کوششوں کے باوجود وہ بل بھی نہ سکا۔ اس نے سوچا شاید مر گیا ہے اور اس کا بے جان جسم کسی ایسا قبر کے سپرد کر دیا گیا ہے جو اوپر سے ایک دم کھلی ہے۔ اور جس کی بلندی پر سفید آسمان تلے ہسپتال کی روشنی نہیں دوپہر کا بالغ سورج چمک رہا ہے۔ اور سفید گاؤن یا ایپران جسم پر ڈالے الہ آبادی امرود کی رنگت والی خوش بودار انار کلی نرس ساوتھری اور خشخشی داڑھی والا خاموش ڈاکٹر انصاری جیسے عرفانی دھوپ ہیں جن کی رفاقت اس کی اعصابی کمزوری دور کر دیں گے اس نے گردن موڑ موڑ کر اپنے ماحول کا بھرپور جائزہ لیا جہاں زیباؔ کھڑی تھی۔ وہ بالکل چپ تھی۔ اس آنکھیں رو رو کر سوج گئی تھیں۔ وہ مریض کے مستقبل سے قطعی بے خبر تھی۔ دیکھتے ہی دیکھتے اُس کی بلوریں آنکھوں میں دوبارہ اشک اُمڈ آئے۔ اور

جالب چیخ اٹھا۔

"ڈاکٹر میرا جسم ادھورا کیوں ہے۔ ؟ !" اور ڈاکٹر کے تسلّی کے باوجود اُسے نیند نہیں آئی تھی۔ بے خوابی کی تکلیف سے اُس کی آنکھیں جلنے لگی تھیں۔ ڈاکٹروں نے مصنوعی کھلا کھلا کر اُسے مصنوعی نیند بخشنی بھی تو اُس کا ذہن جاگا رہا۔ وہ کچی نیند میں جاگے ہوئے بچے کی طرح بہت بے چین تھا —— اور آج چار سال ہو گئے بلکہ کچھ اوپر چار سال کے جس میں وہ سوکھ کر خزاں کی زرد پتی کی طرح خشک ٹہنی نما پلنگ سے چپک گیا تھا۔ یہ پتی کبھی بھی ٹہنی سے جدا ہو سکتی تھی۔ فالج صرف اُس کے جسم کے نچلے حصہ تک محدود نہ تھا بلکہ اُس کے پھیرے اب دل و دماغ تک پھیلتے جا رہے تھے یا پلنگ کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک فالج ہی فالج تھا۔ اور وہ دبیز دوسونی چادر کے تلے چھپ خوب رویا کیونکہ اُس کا اسرا کمزور تھا۔

آج دریچہ پھر کھلا تھا۔ دور حدِ نگاہ تک گہرے سلیٹی رنگ کا دھند مسلط تھا۔ دو وقت مل رہے تھے اور ساون کی گھنی بدلیوں کے کارن اندھیر بڑھ رہا تھا۔ پھر سوئی کی نوک کی طرح باریک پھواریں دھرتی کا سوندھا پن جگانے لگیں اور اُن میں کچھ ہوا کے زور سے بھٹک کر اندر چلی آتیں اور جالب کے خشک لبوں اور اور پچکے ہوئے کھردرے کلّوں کو سیراب کر جاتیں۔ بے سوچے سمجھے اُس نے اپنے لبوں پر جمے ہوئے قطروں کو چاٹ لیا اور جس کی مٹھاس میں اُسے زیبا کے ہونٹوں کی حلاوت کا احساس ہوا۔ مسلسل چار سال تک چت لیٹے رہنے نے اُسے بیڈ سور ہو آیا تھا۔ ساون کی پوربائی میں اُسے زخم کی ٹیس بڑھ گئی تھی۔ مگر آج آسمان کی پنہائیوں میں جھانک کر اُس کا دکھ ہلکا ہو گیا تھا۔ جیسے اُس نے مقدس روحوں کا اُجالا دیکھ لیا ہو۔ اور اس کا دھیان آسمان سے زمین پر اُس گھڑی واپس آیا جب مکان کے نشیبی علاقے میں ہر روز کی طرح آج بھی رام داس تاڑی کی نشے میں چور اپنی بانجھ عورت کو گالیاں دے رہا تھا۔ "تم سالا جورو نہیں کاٹ کی ٹھنڈی کتیا ہو۔" پھر وہ سسکیاں بھرنے لگی۔ اور جب کبھی ایسی گالیاں جالب کے بیمار بستر تک پہونچتی تو وہ خواہ مخواہ محجوب سا ہو جاتا۔

ڈاکٹروں کی انتھک کوششوں کے باوجود جالب میں کوئی توانائی نہیں آئی تھی۔ اُس نے ٹانگوں میں مالش بھی کی۔ سینک سینک کر باندھا اور باندھ باندھ کر کھولا بھی۔ تقا کبوتر کا جوس بھی پیا۔ مگر کمر سے نیچے جیسے گھن سا لگ گیا

تھا۔ پھر بہت مایوس ہوکر بولا۔

"زیبا میں ایک دلدل میں پھنس گیا ہوں جس میں بہت گہرائی تو نہیں مگر اس کی گرفت ناقابل تسخیر ہے"

"زیبا بہت روئی اور روتے روتے اُس کی سوکھی ہوئی گردن میں بیوست ہوکر اُسے بے تحاشہ چومنے لگی۔ اُسے شرم بھی نہ آئی کہ اب وہ بہت نابے بھروسہ ہوگئی تھی۔ اُس کے صندل جیسے چکنے گال اور ستواں ملائم ناک کی رگڑ نے جالب کے جسم میں بجلی سی بھر دی اور وہ بہت مشتعل ہوگیا۔ اُس نے آہستہ آہستہ زیبا کو اپنی قینچی جیسی باہوں میں کسنا شروع کر دیا اور زیبا اُس پر مکمل طور پر جھک گئی مگر اس کی یہ گرفت بھی کچے سوت کی طرح ٹوٹ گئی اور اس نے محسوس کیا جیسے وہ بچوں کے کھلونے پر سوار ہے جس کی نہ کوئی راہ ہے نہ کوئی منزل۔ جالب کا بے خواب پلنگ یہ راز بھی جانتا تھا کہ زیبا کتنی ہی بار رو رو گئی ہے اور اُس کی کھڑکی کا چاند اُس پر کس طرح ہنسا ہے۔ اور وہ کس قدر مجبور ہے کہ اُس کر اُس کے آنسو بھی نہیں پونچھ سکتا۔

"زیبا تم دوسری شادی کرلو"

اور زیبا کا بیضاوی چہرہ پگھلے ہوئے لوہے کی طرح سرخ ہوگیا اور وہ ایک عجیب موڑ پر آگئی۔ راستہ خاموش تھا اور مسافر تھکا تھکا سا۔ ایک لمحہ گذار کر پھر اُس نے کہا۔

"میں نے ایک ڈراؤنا خواب دیکھا ہے زیبا کہ میں کسی لمبے چوڑے ریگستان میں گنجے ببول کے نامکمل سائے تلے اونگھ رہا ہوں اور اونچی شاخوں پر صدیوں کے پرانے گدھ مجھے بڑی لالچ سے دیکھ رہے ہیں اور ان کی چونچ سے ہوس کی رال ٹپکتی ہے اور میرا جسم اُسی میں بھیگ کر کچھ اس طرح جکڑ گیا ہے کہ چاہوں بھی تو تم تک نہیں آسکتا"

یہ کہہ کر وہ تکیہ کے اوپر تھوڑا سرکنے کی کوشش کرنے لگا۔ اُس کی سفید شکن آلود چادر پر بیڈسور سے رستے ہوئے زرد غلیظ پانی کے دھبّے خشک پڑ گئے تھے جیسے شربت گر کر سوکھ گیا ہو اور جس کی مٹھاس پر مکھیاں بھنبھناتی تھیں۔

صبح کا سورج بادلوں میں گھر گیا تھا۔ کل جالب نے جو کچھ کہا تھا اس کا اثر زیبا پر نمایاں طور پر پڑا تھا۔ ہاں اُس کا خوبصورت چہرہ شبنم میں دھلے ہوئے کنول کی طرح اب بھی شفاف تھا۔ خوبصورت چہرے دراصل آسمانی دین ہیں جن کی خنک تابناکی میں جلوۂ ازلی پوشیدہ ہوتا ہے۔ دوپہر تک آسمان گھنے بادلوں کی وجہ سے محدّب رہا شیشے کی طرح چمک رہا تھا اور بجلیاں تھیں کہ سخت بے تاب۔ پھر سہ پہر تک آسمان

اور گاہے زیبا کے ہونٹ بھی چومے تھے ۔ اُس کی سوکھی ہوئی سیاہ ٹانگ جس میں گھنٹہ بھر قبل زیبا نے زیتون کا تیل مالش کر رکھا تھا بستر سے لٹک کر کثیف چھتڑے کی طرح جھول رہی تھی ۔ اس چھتڑے کی مہک اب بستر کی مہک تھی جو کسی بھی مہک سے زیادہ مہلک جو کسی بھی مہک سے زیادہ مہلک ہو گئی تھی ۔ پسینے کی نمی اُس کے جسم میں پیچھے تانبے کی طرح بو پیدا کر رہی تھی اور زیبا تھی کہ گوتم کی سجاتا کی طرح آس لگائے بیٹھی تھی مگر لمحات عرصے میں تبدیل ہوتے گئے اور اس کے گوتم کو نہ مکتی ملی اور پیاسی آتما کو نروان ہی ملا ۔ ڈاکٹروں نے اُس کے مرض کو لا دوا بتایا تھا

ایک دن باسی رساول کی سطح پر دراریں پڑ گئیں ۔ جالب کی بھوک مری مری سی تھی ۔ اس کی سانس کی رفتار بھی مدھم ہو چلی تھی ۔ خواب آور گولیوں کے بکثرت استعمال نے اُسے اور بھی کمزور بنا رکھا تھا ۔ اُس کے بازوؤں پر بندھے ہوئے تعویذ اور مہر شفا کے رنگ اُس کے پلنگ کی طرح پھیکے پڑ گئے تھے ۔ اب اس میں حرص تھی نہ ہوس ۔ وہ بہت اداس تھا ۔ آج سنجوگ سے نشیبی علاقے میں رام داس نے بھیرپی رکھی تھی اور وہ چیخ چیخ کر اپنی بانجھ عورت کو کہہ رہا تھا ۔

" تم سالا جورو نہیں کاتک کی ٹھنڈی کتیا ہو ! "

" کاتک کی ٹھنڈی کتیا ! " اُسے نیند نہ آئی اُس نے محسوس کیا جیسے یہ اندھیری رات سمٹ کر منتظر آنکھوں کے ذریعہ اُس کے جلتے ہوئے سینے میں اُتر آئی ہے ۔ اور وہ اب کبھی نہ سو سکے گا ۔ سرہانے دھری شربتی رنگ کی چھوٹی شیشی میں خواب آور سفید گولیاں فرشتوں کی معصوم نگاہوں کی طرح جھانک رہی تھیں ۔ اس نے دائمی سکون حاصل کرنے لئے پے در پے کئی گولیاں کھا لیں اور تھوڑی سنسناہٹ کے بعد اُس کی روح کپل وستو کے گوتم کی طرح عرفان حقیقت کی طرح میں شاید اُس دریچے سے بہت دور نکل گئی جس کی زنگ آلود سلاخوں سے ہر موسم کا چاند اُسے گھورتا تھا ۔ اس اندھیری رات میں اس کا پلنگ تابوت کی طرح خاموش تھا اور پائینتی لگی نیلی آنکھوں والی کوئی سجاتا یہ سوچ رہی تھی کہ اُسے رہائی ملی یا اسیری ۔

ٹوٹ کر برسا اور جس میں سرو قد اور اجلی برف کی سی جسم والی زیبا نے ڈوب ڈوب کر نہایا۔
بارش کے موٹے موٹے قطروں نے اس کے ننگے جسم میں بجلی سی گدگدی بھر دی تھی اور وہی
قطرے جب چہرے پر بکھر گئے تو سرخ ہتھیلی پر سیماب کی طرح کانپ رہے تھے۔ آنگن
میں کافی پانی جمع ہو گیا تھا اور جو برامدے کی سیڑھیوں سے اتر کر نیچے اتر آتا تھا۔ اس
پانی کی نکاسی کا کوئی راستہ بھی نہ تھا۔ ایک نالی تھی جو بے مصرف ہو کر بند ہو گئی تھی۔
پھر شام ڈھلے صحن کی پیاسی زمین نے پانی خود ہی جذب کر لیا۔

زیبا نہا کر جب قد آدم آئینے کے سامنے بے حجاب گئی تو اُسے اپنی ذات پر کافی
ترس آنے لگا۔ اُسے اپنے بیمار شوہر کا خیال نہ ہوتا تو شاید اپنا بستر بھی الگ کر لیتی
مگر اُس نے سوچا ایسی روحیں مر کر بھی بے سکون رہتی ہیں اور وہ کسی بھی طرح اپنی
عاقبت بگاڑنے کے حق میں نہ تھی اس نے بلاؤز کا بٹن لگاتے وقت محسوس کیا جیسے
چاند جھک گیا ہے اور اب جسم کی وادی بھی ویران اور اندھیری ہو جائے گی ——
پلنگ نے آواز دی اور وہ بھاگی بھاگی جالبؔ تک گئی جس کا چہرہ شیو نہ بننے کی وجہ سے
سوکھی ہوئی چھال کی طرح کھردرا ہو گیا تھا۔ اُس کے چہرے کی ہڈیاں سخت تھیں اور
اس کے گال اتنے پچک گئے تھے کہ پھلانے پر بھی مسطح نہیں ہو پاتے تھے۔ اُس نے
زیباؔ کے ریشم جیسے ملائم بالوں کو اپنی مٹھیوں میں کھینچتے ہوئے کہا۔

"برسن کے پانی سے دھلے ہوئے تمہارے یہ سنہرے بال جب کھلتے ہیں تو ان میں
سے بڑی حیات آفریں خوشبو نکلتی ہے!"

اس دن اودی گھٹاؤں تلے زیبا نے آڑی ترچھی نارنجی رنگ کی ڈوریا ساڑی
پہن رکھی تھی۔ جالبؔ خوب جانتا تھا کہ رنگوں اور موسموں کا بھرپور ادراک عورتوں کو
خوب ہوتا ہے۔ دنیا کی ہر حسین چیز خاموش ہوتی ہے۔ چاندنی ہو یا شفق، رنگ
ہو یا خیال سب خاموش ہوتے ہیں —— زیبا بھی خاموش تھی یا اُس کا دکھ حسین
تھا۔ وہ اُبھر کر بھی رہتی تھی۔ مدت کی بیماری نے جالبؔ کو بہت بے اعتبار بنا
بنا دیا تھا۔ اور اُس کی بے اعتباری کو سہارا اپنشدوں سے ملا تھا "یگ ٹوٹی کشتی
ہے۔" بھر گونندن نے تسلی کے باعث جب کہا تو اُسے نیند سی آنے لگی تھی۔ پلنگ
خاموش تھا مگر حسین نہیں —!!

چوماسا کے ختم ہوتے ہی برگ و گیاہ کی تازگی میں کمی آگئی تھی۔ آج کی رات
اکتوبر کی آخری رات تھی۔ بڑی لمبی تھی اس رات میں جب وہ ساری رات جاگا رہا



دروازے پر ٹنگے ہوئے پردے کی آڑ سے کرسی پر بیٹھے شیشر کو دیکھ کر وہ لمحے بھر کے لئے چونک سی گئی۔

گھٹنوں پر کہنیاں ٹیکے، ہتھیلیوں سے ٹھڈی کو تھامے شیشر جھکا ہوا سامنے کی دیوار کی طرف ایک ٹک تکے جا رہا تھا۔ لیکن وہ جانتی ہے کہ دیوار اُسے نہیں دکھائی دے رہی ہے۔ اس نگاہ کو وہ اچھی طرح جانتی ہے۔ پہلے تو اس سے ڈر لگتا تھا لیکن پھر دھیرے دھیرے عادت پڑ گئی۔

کنپٹیوں پر بال سفید ہو گئے ہیں، سر میں بھی ایسا ہی ہوگا لیکن دور سے دکھائی نہیں دیتا۔ گالوں کی ہڈیاں ابھر آئی ہیں اور پتلون کے اندر سکڑی ہوئی ٹانگوں کا وہ حصہ دکھائی دے رہا تھا وہ بھی سوکھی لکڑی جیسا لگتا ہے۔ وہ چپ چاپ کھڑی رہی۔ شیشر کو یہ جاننے کی ذرا بھی خواہش نہ ہوگی کہ وہ اندر کہاں ہے، کیا کر رہی ہے۔ اس کے آنے سے اسے کیسا لگ رہا ہے؟ شاید وہ اس کے بارے میں ذرا بھی سوچ نہیں رہا ہوگا۔

"پتاجی کہہ رہے ہیں، تم تو کبھی خط ڈالتے نہیں۔ تمہیں کیا پتہ کہ گھر میں کون مرا، کون جیتا ہے۔"

شیشر ہلے جلے بغیر چپ چاپ کرسی پر بیٹھا ہوا ہے۔ گھر میں اور گھر کے باہر سناٹا چھایا ہوا ہے۔ خاندان کا اکلوتا لڑکا پانچ سال کے بعد گھر لوٹا ہے لیکن گھر میں کوئی ہلچل نہیں۔

اس بار ہوا سے پردہ زور سے ہلا اور اس نے شیشر کو سر سے پاؤں تک دیکھا۔ اس کی بڑھی

بڑی آنکھیں نہ جانے کون سی سونی سونی ویران دنیا بسائے ہوئے ہے۔ جس کے اندر جھانکنا اس کے بس کی بات نہیں۔

"تمہاری ماں آخری بار تمہیں دیکھنے کی تمنّا لیے ہوئے چل بسی۔ بھگوان اس کی آتما کو شانتی دے —" پھر ایک لمحہ کے بعد ذرا کچھ جذباتی لہجے میں پتاجی بولے:-

"میں تو اپنی بیماری کی خبر تمہیں کبھی نہ بھیجتا۔ ہونے تار ڈالنے کے بعد ہی مجھے بتایا۔"

باہر شام کا اندھیرا بہت تیزی سے گہرا ہوتا جا رہا تھا، اسے ایسا لگا جیسے من کے اندر جو قصے جاگی تھی وہ دھیرے دھیرے پھر سونے لگی ہے۔ اسے جگائے رکھنے کی اس نے پوری کوشش کی، پھر ہار مان کر اپنی مزاحمت ختم کر دی اور آنگن میں چلی گئی۔

وہ باورچی خانے میں جا کر روز کی طرح رات کا کھانا پکانے لگی۔ آج کچھ غیر معمولی بات ہو گی ہے۔ اس کا اسے کوئی احساس نہیں۔ کل اور آج میں کوئی فرق نہیں۔

ببّو جب کھیلنے کے بعد آنگن کے دروازے سے اندر آیا تو ایک لمحے کے لیے وہ چونک سی پڑی۔ وہ اس طرح دھول میں اٹا ہوا، پرانے کپڑے پہنے اندر نہ چلا جائے یہ سوچ کر وہ فوراً اٹھی اور ببّو کا ہاتھ پکڑ لیا۔

سات برس کا ببّو کچھ سمجھ نہیں پایا اور وہ بھی فیصلہ نہیں کر پائی کہ اسے سب کچھ کس طرح بتایا جائے۔ باپ نام کا بھی کوئی شخص ہوتا ہے جو گھر پر نہیں رہتا، جو خط نہیں لکھتا اور جو پانچ برس کے بعد اچانک ایک شام کو گھر آ جاتا ہے۔ کسی بن بلائے مہمان کی طرح..............

اس نے ببّو کا منہ ہاتھ دھلا کر، بالوں میں کنگھی کی، نئی قمیص اور نیکر پہنائی اس کے ہاتھ بار بار کانپ جاتے لیکن آنکھوں میں برسوں سے جمی ہوئی کیچ سے پانی کی ایک بوند بھی نچوڑ نہیں پائی۔

"دادا کے پاس جو بیٹھے ہیں، ان کے پاؤں چھونا۔ وہ اپنے پاس بلائیں تو چپ چاپ چلے آنا۔ بولنا نہیں — بس۔"

اتنی ہمت اس میں نہیں کہ پردے کی آڑ سے دیکھے کہ ببّو کو دیکھ کر شیکھر کے چہرے پر جذبات کس طرح بدل جاتے ہیں۔

باورچی خانے میں جا کر چولہے کے پاس گھٹنوں پر منہ ٹیکے وہ بیٹھی رہی، آنگن میں کچھ پرندے شور مچا رہے تھے لیکن اندھیرے میں کچھ دکھائی نہیں دیتا۔

ببّو کے کپڑے کیوں بدلے؟ اس کا ہاتھ منہ کیوں دھویا؟ اس حرکت کے فضول اور بیکار ہونے کا احساس اسے اب ہوا۔ اچانک اُسے یاد آیا کہ اپنی ساڑی اس نے اب تک نہیں بدلی۔ یہ سوچ کر اسے قدرے اطمینان ہوا۔ اگر بدل لیتی تو اپنی غلطی پر پشیمان ہوتی۔

ببو کو شیشر سے کتنا پیار ہے۔ اسے وہ بھلی بھانت جانتی ہے۔ بچوں کے لئے اس کے من
ایک کمزوری ہے لیکن اس پر بھی شاید اس نے فتح پالی ہے نہیں تو پانچ سال میں کیا ایک بار بھی ا
کے دل میں ببو کو دیکھنے کی خواہش پیدا نہ ہوتی؟ جب ببو پیدا ہوا تھا تو اس رات اسپتال کی چار
پر لیٹے لیٹے اس کے دل میں امید کی ایک ہلکی سی کرن پھوٹی تھی۔ شاید وہ ان دونوں کے بیچ کی کھ
کو کم کرنے میں مددگار ثابت ہو لیکن کھائی بہت ہی چوڑی تھی۔ اسے پاٹنے کے لئے ببو کو استعمال کرنا
کو بیکار اور فضول سا لگا۔ لیکن ان سب باتوں کو سوچنے سے کیا فائدہ۔؟

آنگن میں کھڑے ہو کر اوپر آسمان میں تارے دکھائی پڑتے ہیں۔ ان کی دوری کم نہیں ہو سکتی۔
اندر سب چپ ہیں۔ پتاجی نے شاید تھک کر آنکھیں موند لی ہیں۔ پتہ نہیں
بٹھایا ہے یا وہ پتاجی کی چارپائی پر بیٹھے بیٹھے ہی شیشر کو دیکھ رہا ہے۔

شیشر بہت بدل گیا ہے۔ اپنے جسم کی طرف سے اتنی لاپرواہی اس نے دوسرے کسی شخص م
نہیں دیکھی۔ ایک بار جب کھانسی کا مرض لگا ہوا تھا تو رات رات بھر نیند نہیں آتی تھی۔ اس نے کتنی ب
کسی ڈاکٹر کو دکھلانے کو کہا، لیکن ڈاکٹر کا نام سنتے ہی اسے طیش آجاتا۔ پتہ نہیں کہیں کام کرتا ہے یا بیکا
پوچھنے پر بھی شیشر بات کو ٹال دے گا۔ ایسی باتیں اُسے بیکار لگتی ہیں۔ اسے یہ جان کر گھبراہٹ س
لگتی ہے کہ کوئی دوسرا اس میں دلچسپی لے رہا ہے۔

تب وہ سوچنے لگی کہ رات کو سونے کا انتظام کس طرح کیا جائے۔ ایک لمحہ کے لئے من
ہوک سی اُٹھی لیکن پھر اسے اپنے اوپر ہنسی آگئی۔ وہ بھی بیکار کی باتیں کتنا سوچتی ہے۔ ایسی باتیں جن
نہ سر ہوتا ہے نہ پیر۔ اپنے کمرے سے چارپائی نکال کر اس نے آنگن کے ایک کونے میں بچھا دی جس
اوپر ٹین کا ایک ٹکڑا چھت کا کام دیتا ہے۔ کمرے میں اپنے اور ببو کے لئے فرش پر ہی بستر بچھا دیا
یہ انتظام شیشر کے موافق بھی رہے گا۔

کہیں دور سے بینڈ بجنے کی دھیمی دھیمی آواز سنائی دے رہی ہے جو رات کے سنّاٹے میں ک
کے رونے کی آواز معلوم ہوتی ہے۔

ببو لوٹ کر نہیں آیا۔ وہ حیرت بھری نگاہوں سے شیشر کو دیکھ رہا ہوگا۔ چہروں کا جائزہ لی
میں اسے بڑا مزہ آتا ہے۔ ہاتھ منہ دھونے کے لئے کیا شیشر اندر میں آئے گا؟ کھانا بھی تو کھانا ہ
رات بھر کی تھکن ہوگی۔ گھر میں چار نفوس کے ہوتے ہوئے بھی کوئی آواز نہیں۔ چاروں طرف مہیب خاموشی
چھائی ہوئی ہے۔

آنگن کی طرف آتی ہوئی کالی پرچھائیں کو دیکھ کر وہ ڈر ہی گئی۔ سارا جسم ایک بار لرز اٹھا۔ اس کے
جوتوں سے آواز نہیں ہو رہی تھی۔ اس کے جی میں آیا کہ چیخ مار کر اس پرچھائیں کو وہیں روک دے۔ لیکن

اس سے کچھ فاصلے پر ششیتر خود ہی رُک گیا

"ہاتھ منہ دھو تو غسلخانے میں پانی رکھا ہے" وہ دھیمے لہجے میں بولی۔

ششیتر بغیر کچھ کہے غسلخانے میں چلا گیا۔

پتا جی کو دوا دیتے وقت اس کی آنکھیں ہیں۔ وہ جانتی ہے کہ وہ اس کے چہرے کی طرف دیکھتے ہوئے کچھ ڈھونڈنے کی کوشش کر رہے ہیں، لیکن وہ خود بھی تو اس "کچھ" کو کبھی نہیں کھوج پائی۔ کبھی کبھی ان کی یہ نگاہ ناقابل برداشت بن جاتی ہے۔ ببو کو لیکر یا اُسے بھی وہیں چھوڑ کر کہیں دور بھاگ جانے کی خواہش ہوتی۔ تب غسلخانے میں اپنے آپ کو بند کر کے وہ روتی اور آواز باہر جانے کے خوف سے ساری کا پلّو منہ میں ٹھونس لیتی۔ اب عادت پڑ گئی ہے۔ اس طرح کی باتیں اب وہ نہیں سوچتی ہے۔

رات کو بہت دیر تک نیند نہیں آسکی، کمرے میں اندھیرا ہونے پر بھی چھت اور دیوار پر دھندلی دھندلی سی شکلیں دکھائی آتے دکھائی دیتی ہیں۔ پاس لیٹے ہوئے ببو کا لمس اور اس کے جسم کی حرارت کو محسوس کرنے کے لئے وہ اس کے قریب کھسک گئی۔ اُسے چارپائی پر لیٹتے ہی نیند آجاتی ہے۔ من کی گتھیوں میں الجھی ہوئی جب وہ رات رات بھر جاگا کرتی تھی تو دوسری چارپائی پر لیٹے ہوئے ششیتر کی گہری نیند سے اُسے حسد ہونے لگتا تھا۔

پھر یہ کچھ خاموشی کے سمندر میں کھو گیا ۔ بھاری چٹان کے گر جانے میں کچھ دیر کے لئے اب بلبلے ہی اُٹھتے ہیں اور وہ بھی فوراً ٹوٹ جاتے ہیں۔

آنکھ کھلنے پر باہر اندھیرا دکھائی دیتا ہے لیکن لگتا ہے جیسے نیند پوری ہو گئی ہو۔ پھر پانچ کے گھنٹے سنائی پڑے ۔ ایک گھنٹے ابھی اور لیٹے رہنا پڑے گا۔ اچانک باہر سوتے ہوئے ششیتر کا خیال دل میں آیا۔ وہ چونک سی پڑی ۔ اُس کے وجود کو وہ بھول ہی گئی تھی ۔ یہ سوچ کر اسے تعجب ہوا۔ چارپائی پر لیٹے لیٹے ششیتر کو ایک بار دور ہی سے دیکھنے کی خواہش بہت تیزی کے ساتھ اس کے دل میں پیدا ہوئی ۔ ......

دور سے ہی اسے ششیتر کی جلتی ہوئی سگرٹ کا سرا دکھائی دیا۔ کیا وہ رات بھر سگریٹ پیتا رہا ہے ، وہ دیکھ رہی ہے مگر اندھیرے میں ٹھیک سے کچھ دکھائی نہیں دیتا۔ جلتی ہوئی سگرٹ بار بار ہونٹوں تک جاتی، پھر ایک لمحے کے لئے چمک اُٹھتی۔ کہیں کوئی شور نہیں، دور دور تک پھیلا ہوا اندھیرا اور سناٹا....

"سنو......" ششیتر کی ہلکی سی آواز سن کر اس کے پیر کانپنے لگے۔

ششیتر چارپائی پر اُٹھ کر بیٹھ گیا۔ سگریٹ اس نے آنگن کے ایک کونے میں پھینک دیا اور بولا:

"اِدھر آجاؤ"

وہ اس کے پاس جا کر کھڑی ہو گئی۔ ناحق ہی اپنا بستر چھوڑ کر وہ آنگن میں آئی۔ دن کے وقت

شیشر سے ایک دو باتیں کرنے میں اسے تردد نہ ہوتا۔ لیکن اس وقت اکیلے شیشر کا سامنا کرنے میں اُسے ڈر سا لگا۔ وہ چارپائی کے دوسرے سرے پر بیٹھ گئی۔

شیشر سامنے آنگن کی کچی دیوار کی طرف خالی خالی آنکھوں سے تاک رہا تھا، اُس کا چہرہ دکھائی نہیں دیتا۔ قریب سے دیکھنے کی جو خواہش اس کے دل میں تھی وہ اس لمحہ ختم ہو گئی۔

"بٹو بہت بڑا ہو گیا ہے" شیشر گویا اپنے آپ ہی سے کہہ رہا ہے۔ "کیا اسکول میں پڑھنے جاتا ہے؟"

اس نے اقرار میں گردن ہلا دی۔

"تمہارا اسکول تو ٹھیک چل رہا ہے؟" پھر ایک لمحہ رک کر بولا: "بہت کام پڑ جاتا ہوگا"

کیا یہی کہنے کے لئے شیشر نے اسے اپنے پاس بلایا ہے؟ — وہ رسمی باتیں جن میں کہنے اور سننے والے کو کوئی دلچسپی نہیں ہوتی۔

ایک ہی خاموشی دونوں کو الگ الگ دائروں میں باندھ رہی ہے۔

ان دونوں میں سے کوئی بھی ایک دوسرے سے کچھ نہیں پائے گا۔ یہ بات وہ اچھی طرح جانتی ہے۔ شادی کے بعد جب سترہ برس اس طرح بغیر کچھ کہے سنے گزر گئے تو آج وہ دبیز کہرا کیسے دور ہو جائے گا؟ چارپائی کے دوسرے سرے پر بیٹھے بیٹھے وہ اس لمحہ کی تمنا کر رہی ہے جو بیت چکا ہے۔

"بابو جی بہت کمزور ہو گئے ہیں" شیشر نے کہا

اسے ایسا لگا جیسے شیشر کو یہ خدشہ ہو کہ اب پتا جی بچیں گے نہیں ...... پھر اس کا کیا ہوگا؟ یہ دونوں اکیلے تو اس مکان میں رہ نہیں سکتے۔ کیا شیشر یہی سب کچھ سوچ رہا ہے؟

رات کے آخری پہر کا اندھیرا دھیرے دھیرے دور ہونے لگا۔ پاس ہی کوئی پرندہ جاگ کر زور زور سے چیخ رہا ہے۔ پتہ نہیں شیشر نے اُسے دیکھا بھی ہے یا نہیں؟ اس کی نگاہ کبھی فرش پر کبھی سامنے کی دیوار پر چکر لگا رہی ہے۔ اگر راستے میں اچانک دونوں کی مڈبھیڑ ہو جائے تو شاید شیشر اسے پہچان تک نہ پائے —

وہ چپ چاپ بیٹھی رہی۔ چاروں طرف بنی چھوٹی سی چہاردیواری کے دائرے میں وہ اپنے آپ کو بھول سی گئی۔ ہاتھ بڑھاتے ہی جس شخص کو چھوا جا سکتا ہے، وہ اس کا شوہر ہے اُس کا احساس ہونے پر بھی حیرت نہیں ہوتی۔ پھر بھی یہ جاننے کی بے چینی کم نہیں ہے کہ وہ کیسے رہتا ہے۔ گھر میں کھانا کھاتا ہے یا ہوٹل میں، کہیں نوکر ہے یا نہیں۔ اگر ہے تو کتنی تنخواہ ہے؟ — لیکن ایک حد ایسی بھی آتی ہے جس کے بعد بڑے سے بڑے سوال کی بھی کوئی اہمیت نہیں رہتی۔

ایسی ہی ادھیڑبن میں ایک رات وہ دونوں اس طرح چارپائی کے دو سروں پر کتنی ہی دیر

بیٹھے رہے تھے۔ شاید آٹھ نو برس پہلے کی بات ہے۔ جب کبھی اس کی یاد آتی ہے تو دیر تک سب کچھ بھول کر نہ جانے کون سی اجنبی وادیوں میں پہنچ کر بھٹکنے لگتی ہے۔ جس کا اور چھور نہیں جانتی۔ مکان کے بند دروازے کے سامنے بکس پر بیٹھے بیٹھے نہ جانے کتنا سمے بیت گیا اور ستیشر کا کوئی پتہ نہیں۔ ایسا لگتا جیسے وہ کبھی نہیں آئے گا۔ وہ بند دروازہ ان کے لئے ہمیشہ بند رہے گا۔

اس رات ستیشر نے جاننا چاہا تھا کہ وہ کیوں آئی ہے؟ حالانکہ یہ سوال اس نے پوچھا نہیں لیکن اس کی آنکھوں کی زبان کا کچھ کچھ مطلب وہ سمجھتی تھی۔ لیکن اس وقت اس کے سامنے ان سب سے بڑا سوال تھا۔ بی ٹی پاس کر کے وہ کسی اسکول میں استانی بن سکتی ہے۔ اور اس کے لئے اُسے ستیشر کے پاس شہر میں آنا ہی تھا۔

ستیشر کے ساتھ بتایا ہوا وہ ایک سال اسے خواب کی بات معلوم ہوتی ہے۔ جو صرف دیکھا بھر تھا جیا نہیں تھا۔ پھر بھی وہ اس کی شخصیت کے ساتھ جڑا ہوا تھا۔ جسے کبھی چاہنے کے باوجود وہ کاٹ کر الگ نہیں پھینک سکتی۔ اس سال ببّو کے وجود کا احساس اس کو ہوا تھا، لیکن گوشت و پوست کا وہ کوئی جیتا جاگتا فرد ہو سکتا ہے۔ اس پر اسے یقین نہیں ہوتا ہے۔

اسپتال میں اس نے اس رات محسوس کیا تھا کہ اس وقت اگر اس کی موت ہو جائے تو اُسے ذرا بھی دکھ نہیں ہوگا۔ وہ ایک ایسی منزل پر آ پہنچی تھی، جہاں مشکل سے مشکل مسئلہ بھی اپنے آپ ہی حل ہو جاتا ہے۔ وہ لمحہ وہ کبھی نہیں بھول سکی۔

اب سامنے بیٹھا ہوا ستیشر اُسے پہچانتا تک نہیں، کبھی بھی پہچانا ہو اس پر اسے شک ہے۔

پھر زندگی پہلے کی طرح بیتنے لگی۔ ستیشر کے آنے سے کہیں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی۔ ایسا لگا، جیسے وہ کبھی گھر سے باہر گیا ہی نہ ہو۔

ستیشر پر گھر کی کوئی ذمہ داری نہیں ڈالی گئی۔ نہ روپئے پیسے کی، نہ گھر کے انتظامی امور کی۔

جب ستیشر تاجی کے کمرے میں بیٹھا ہوتا تو وہ یا تو کروٹ بدل کر دوسری طرف دیکھنے لگتے یا آنکھیں موند لیتے۔ وہ گھنٹوں دریچہ کے پاس رکھی بید کی کرسی پر بیٹھا رہتا، ہاتھ گود میں دبے رہتے، آنکھیں ادھر اُدھر بھٹکنے کے بعد کسی ایک نقطے پر رُک جاتیں۔ جب سگریٹ پینے کی خواہش ہوتی تو سگریٹ سلگا کر برآمدے میں بیٹھ جاتا یا گھر سے ملی ہوئی کچی سڑک پر ٹہلنے لگتا۔ دن اسی طرح بیت جاتا۔

رات کو آنگن میں بچھی چارپائی پر لیٹتے ہی اُسے نیند آجاتی۔

تاجی کی صحت اب ٹھیک ہو چلی تھی۔ صبح شام تکیہ کا سہارا لگا کر کچھ دیر کے لئے وہ اپنی چارپائی پر بیٹھنے لگے۔ ستیشر جب کمرے میں رہتا تو موٹی موٹی آنکھوں سے وہ اس طرف دیکھتے رہتے۔ جیسے اس کے کچھ کہنے پر وہ فوراً مدد پہنچانے کے لئے تیار ہو جائیں گے۔ لیکن ستیشر نے اُن سے کچھ نہیں مانگا۔ کبھی کچھ نہیں مانگا۔

"تم شام کو تھوڑا گھوم آیا کرو۔ سارا دن گھر میں بیٹھے بیٹھے اُکتا جاتے ہو گے،" وہ شفقت بھر
میں کہتے اور ششیر اپنی گھبراہٹ چھپانے کے لئے پتلون کی جیب میں اپنے ہاتھوں کو ڈال دیتا۔
"تمہارا دوست آنند تو یہیں ہے۔ تمہارے بارے میں کتنی ہی بار پوچھ چکا ہے۔ اب تو وہ
گیا ہے۔ چھ سو تنخواہ پاتا ہے، کبھی اس سے مل کیوں نہیں آتے؟"
ششیر کا زرد چہرہ اور بھی زرد پڑ گیا۔ اسے یاد آیا کہ برسوں پہلے بھی وہ اس طرح کی باتیں کرتے
مکان کے ساتھ کتنی ہی یادیں وابستہ ہوتی ہیں جو دھندلی ہو جانے پر بھی ارد گرد گھوما کرتی ہیں
کو جب وہ دکھائی دیتی ہیں تو وہ آنکھیں موند لیتا ہے۔
ہر شام کو بنو مکان کے سامنے پڑوس کے بچوں کے ساتھ نکلتا ہے۔ ششیر برآمدے
اُنھیں دیکھا کرتا ہے۔ اُن کا شور سنتا ہے لیکن جو آواز صاف صاف اس کے کانوں میں پہنچتی ہے اُس
وہ چونک سا جاتا ہے۔ جیسے یہ اس کی اپنی ہی آواز ہو جو اس نے ایک عرصے کے بعد سُنی ہے۔ اس کے پا
جانے کی خواہش ہوتی ہے لیکن ہمت نہیں پڑتی۔
وہ سوچتی کہ کہیں زندگی سپاٹ راستے پر جاتے جاتے مڑ تو نہیں رہی ہے؟ پہلے بھی کئی بار اس
ہی بھرم ہو چکا ہے۔ پہلے اس خیال سے مسرت ہوتی تھی، بند بند سی آنکھیں عجیب عجیب سے خواب دیکھ
لگی تھیں لیکن اب تو ڈر سا لگتا ہے۔ اپنے اوپر اعتبار نہیں رہا۔
جب کبھی ششیر سے نگاہیں چار ہوتیں تو وہ کانپ سی جاتی۔ شادی کے بعد پہلی بار اُسے ششیر
سے ڈر لگنے لگا تھا۔ رات کو لیٹے ہوئے کبھی کبھی وہ محسوس کرتی کہ اگر ششیر یہاں سے چلا جائے تو اُسے
خوشی ہی ہوگی رنج نہیں۔ یا یہ صرف اس کا بھرم ہی ہے۔ سوتے سوتے اسے لگتا جیسے ششیر دروازے
پر کھڑا ہے۔ اس کی سانس رکنے لگی اور آنکھیں کھول کر دروازے کی طرف دیکھنے کی ہمت اس میں نہیں
ہوتی۔۔۔۔

یہ کیا ہو رہا ہے؟ وہ سوچتی، مجھے کیا ہو گیا ہے؟ اگر یہی حال کچھ دنوں تک رہا تو میں پاگل ہو جاؤں گی
اسے لگتا جیسے ششیر مجرم کی طرح گھر میں رہ رہا ہے جہاں نہ کبھی اس کی آواز سنائی دیتی
ہے، چلتا ہے تو پیروں کی آہٹ نہیں ہوتی اور سوتے وقت جیسے کروٹ بدلنے میں بھی اُسے ہچکچاہٹ
ہوتی ہے۔

ششیر کچھ کہنا چاہتا ہے ـــــــ یا یہ خیال بھی اس کے دماغ کی اُپج ہے۔ پہلے بھی تو
ایسا بھرم ہو چکا ہے۔ بنو کو گود میں لے کر جب وہ اسپتال سے لوٹی تھی، تب بھی تو ششیر کی نگاہ دیکھ کر
اس نے ایسا ہی محسوس کیا تھا۔ پھر دن بیتے، مہینے بیتے لیکن اس کے منہ سے وہ بات نہ نکلی جس کا انتظار
بے چینی سے وہ انتظار کر رہی تھی۔ لیکن اس بار نگاہ میں پھر کچھ سمایا سا جان پڑتا ہے۔ سونا پن پہلے ہی

جیسا ہے۔ لیکن اس سونے پن میں ریت کے کچھ ذرّے چمکتے ہیں........ وہ گھٹنوں پر منہ ٹیکے سوچا کرتی۔
شیکھر کو گھر آئے کتنے دن بیت گئے۔ بتاجی نے سوچا کہ شاید وہ کہیں نوکر نہیں تھا، ورنہ اب تک وہ واپس چلا گیا ہوتا۔ ان کی بیماری کا بہانہ بھی اُس کے پاس نہیں ہے۔ شیکھر سے پوچھنے میں اُنھیں جھجک ہوتی ہے۔
لگتا ہے شیکھر کی چھٹیاں کبھی ختم نہیں ہونگی۔ جیسے بتاجی کی بیماری کا تار پانے کا وہ انتظار ہی کر رہا تھا۔
ایک دن صبح ہی نہا دھو کر شیکھر باہر چلا گیا۔ اسکول سے لوٹ کر اسے پتہ چلا کہ شیکھر کا کھانا ویسے ہی نعمت خانے میں پڑا ہوا ہے تو اسے کچھ فکر ہوئی۔ کمرے میں اس کا سامان پڑا ہوا ہے تو اُسے کچھ فکر ہوئی۔ لیکن سامان چھوڑ کر بھی بغیر کسی سے کہے سُنے وہ کہیں جا سکتا ہے، اس بات کو وہ اچھی طرح جانتی تھی۔ بتاجی سے اس موضوع پر گفتگو کرنے کی ہمت نہیں پڑتی۔ شام تک وہ اسی ادھیڑ بن میں وہ گھر میں اِدھر اُدھر چکر لگاتی رہی۔ دل کو تسلّی نہیں ملی تو وہ غسلخانے میں جا کر نل کھولکر وہ زور زور سے روتی رہی۔ کھڑکی سے باہر اور دور تک سنسان سڑک پر اس کی آنکھیں کچھ تلاش کرتی رہیں۔ لیکن کہیں کچھ دکھائی نہیں دیتا۔
کافی شام ہو جانے پر بتاجی کے کمرے میں شیکھر کی آہٹ ملی تو وہ چپ چاپ اس سے ملے ہوئے کمرے ہی میں بیٹھی رہی۔ نہ من میں کچھ جاننے کا شوق پیدا ہوا نہ کوئی ہلچل سی ہوئی ___ پچھلے چند گھنٹوں کی بے چینی کو وہ بھول سی گئی۔
شیکھر بتاجی سے کہہ رہا تھا کہ آنند نے اسے اپنے ہی دفتر میں نوکری دلا دی ہے اور آج سے اس نے کام بھی شروع کر دیا ہے۔ بتاجی یہ خبر سُن کر کچھ دیر کے لئے حیران سے رہ گئے۔
جو لڑکا گھر اور گھر والوں کے سائے سے ہمیشہ دور بھاگتا رہے وہ اب ہمیشہ کے لئے گھر ہی میں رہے گا۔ یہ سوچ کر خوشی تو ہوئی ہی لیکن حیرت زیادہ ہوئی۔ جذباتی ہو کر وہ کتنے ہی سوال کرتے رہے ___ کس طرح کا کام ہے؟ کیا کام ہے؟ کیا تنخواہ ہے؟ آگے ترقی ہونے کی کیا امید ہے؟ یہ سب باتیں سُنتے ہوئے وہ ساکت بیٹھی رہی جیسے ذرا بھی دلچسپی نہ ہو۔ کچھ دیر بعد شیکھر کمرے کے اندر آیا اور اُسے چپ چاپ بیٹھے دیکھ کر سمجھ گیا کہ اس کی نوکری کی خبر اس نے سُن لی ہے۔ اس کے چہرے پر اداسی دیکھ کر وہ غسلخانے میں کپڑے بدلنے چلا گیا۔ گھر میں پھر سناٹا چھا گیا۔ ببو ابھی تک کھیل کر نہیں آیا۔
ضرورت ہونے پر بھی وہ بتاجی کے کمرے میں نہیں جا سکی۔ بغیر کچھ کہے ان کی آنکھیں جو پوچھیں گی اس کا جواب وہ نہیں دے پائے گی۔ وہ سمجھ نہیں پا رہی تھی کہ دل میں یہ کیسی اتھل پتھل ہو رہی ہے۔ کمرے کے اندر دھیرے دھیرے شام کا اندھیرا گھنا ہوتا جا رہا ہے اور اس اندھیارے میں وہ کھوئی جا رہی ہے۔ اپنی خاموشی کھلنے لگی ہے۔ پھر دھیرے دھیرے جانے کب چپکے سے آنکھیں نم ہو گئیں۔ اس کا پتہ اسے نہیں چلا۔

اس لمحے اُس نے محسوس کیا جیسے وہ اچانک بالکل اکیلی رہ گئی ہو۔

شیتنر کی طرف وہ نہیں دیکھتی۔ اسے لگا کہ کئی دن سے اسے شیتنر کی صورت نہیں دیکھی، حالانکہ وہ اسی گھر میں رہتا ہے، سوتا ہے، ایک آدھ بات بھی کبھی کبھی کرنا پڑتی ہے۔ جبتو میں بھی پہلے کی طرح وہ اپنے آپ کو کھو نہیں پاتی۔ اس کے کپڑے بدل دیئے۔ اسکول کے لئے تیار کر دیا، کھانا کھلا دیا اور جو اس نے پوچھا اس کا مختصر سا جواب دے دیا۔ احساس کئے بغیر جی میں ایک عجیب قسم کی بے کیفی سمائی رہتی۔ اس کی یہ گہری خاموشی دیکھ کر شیتنر کو کچھ بھی کہنے یا پوچھنے کی ہمت نہیں پڑتی۔

رات کو بہت دیر تک اُسے نیند نہیں آتی۔ لیٹے لیٹے سونی آنکھوں سے وہ دیوار کی طرف تکتی رہتی۔ دل میں کوئی گرہ تھی جو یک بیک اپنے آپ کھل گئی۔ شیتنر میں اچانک اتنی بڑی تبدیلی کیسے آگئی؟ پہلے بھی تو کئی بار پتاجی نے اور خود اس نے بھی شیتنر سے نہیں کام ڈھونڈھنے کے لئے کہا تھا۔ لیکن ایسا بھی کبھی ممکن ہو سکتا ہے، شیتنر نے لمحہ بھر کے لئے بھی نہیں سوچا ہوگا۔ پھر آج کون سی نئی بات پیدا ہو گئی؟ پتاجی لاکھ مجھ سے ہمدردی جتائیں لیکن بیٹا تو آخر بیٹا ہی ہے۔ وہ کسی کو الزام نہیں دے گی۔ اسکول سے ایک لمبی چھٹی لے کر وہ اپنی بڑی بہن کے یہاں چلی جائے گی۔

گھر کے کسی بھی کام میں اس کا جی نہیں لگتا۔ من ہر پل ہلکان سا لگتا ہے جیسے وہ خلا میں معلق ہو۔ اسکول میں بھی دل اچاٹ سا رہتا۔ یہ تو غنیمت کی بات تھی کہ کسی دوسری استانی کو شیتنر کے واپس لوٹنے کی خبر نہیں ملی تھی ورنہ سب مبارکباد پیش کرتیں، مٹھائی کھانے کی ضد کرتیں اور یہ سب اس کے لئے برداشت کرنا آسان نہ ہوتا۔

ایک دن کام سے لوٹ کر اُسے آنگن میں بیٹھے دیکھ کر شیتنر اس کے پاس جا کھڑا ہوا۔ ڈھلتے ہوئے سورج کی روشنی میں وہ صرف اس کی دھندلی سی پرچھائیں ہی دیکھ پائی۔

"تمہاری صحت بہت گرتی جا رہی ہے۔ کسی ڈاکٹر کو کیوں نہیں دکھلاتیں؟"

وہ بسو کا ئیل اوور بُن رہی تھی، آنکھیں جھکائے بُنتی رہی۔

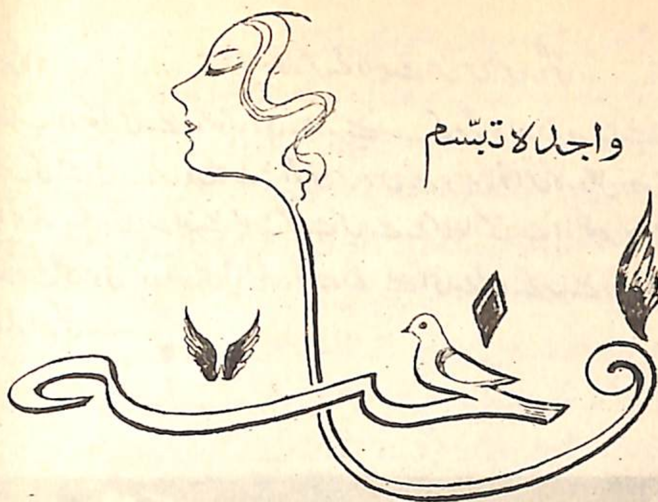
اسکول میں زیادہ کام پڑ جاتا ہو تو چھوڑ دو۔ اب تو اس کی خاص ضرورت بھی نہیں رہ گئی ہے

اپنی باتوں کا کوئی جواب نہ پا کر بھی شیتنر وہیں کھڑا رہا۔ جیسے اس کی خاموشی توڑے بغیر وہ وہاں سے ہلے گا نہیں۔

لیکن وہ جانتی ہے کہ شیتنر کے کسی بھی سوال کا جواب اس کے پاس باقی نہیں بچا ہے۔

کتنا سمے، کتنا طویل وقت اس طرح گزر گیا۔ اچانک شیتنر کے وجود کا احساس کر کے اُس کے ہاتھ اپنے آپ ہی ایک جھٹکے کے ساتھ رُک گئے۔ وہ خلا میں دیکھتی رہی، جہاں کچھ دیر پہلے شیتنر کھڑا تھا۔ مجھے کیا ہو رہا ہے ــــــ؟ اس کی انتہا کیا ہوگی؟...... یہ سلسلہ کہاں

ختم ہوگا؟ .... خاتمہ کا انتظار کرنے کی ہمت اس میں نہیں رہ گئی .... آنکھوں میں
اضطراب اور بیقراری لئے وہ سوچتی رہی۔ اندر جیسے سب کچھ مرگیا ہو اور زندہ رہنا جیسے اب اس
کے بس کی بات نہیں۔ اس طرح کا حادثہ اگر نو دس برس پہلے ہوا ہوتا تو اس کا ردعمل دوسرے ہی طرح
کا ہوا ہوتا۔ پیچھے جتنا راستہ بغیر چلے چھوٹ گیا ہے کیا اسے طے کیا جا سکتا ہے؟ آنکھیں بھر آئیں، اپنے
اوپر جھلاّہٹ بھی ہوئی، اور غصہ بھی آیا لیکن اُسے لگا جیسے اپنی بے بسی کے سامنے وہ ہمیشہ ہمیشہ کے
لئے ہار مان گئی ہے۔



واجدہ تبسم

مینا ابھی ابھی بستر پر سے اُٹھ کر گئی تھی۔ اس کے بدن کی گرمی سے بستر گویا جھلس رہا تھا سر کے دباؤ سے تکیہ کے بیچ میں ایک گول سا نشان پڑ گیا تھا۔ چوٹی جو پیٹھ کے نیچے دب گئی تھی، اُس نے چادر پر اپنا بل کھایا ہوا نقش چھوڑ دیا تھا اور پورا بستر بھینی بھینی خوشبو سے مہک رہا تھا۔

بشیر میاں جوتے اتار کر بستر پر بیٹھنے لگے تو اک دم انھیں مانوس سی خوشبو کا احساس ہوا۔ بستر پر بیٹھے تو اُسے بڑا نرم نرم، گرم گرم سا پایا، جیسے فاختہ کے پر۔

"سوں" کر کے اُنھوں نے زور سے سانس لی اور ناک سے ہوتی ہوئی خوشبو ان کے دل تک اتر گئی، اک دم وہ بوکھلا سے گئے۔ یہ کیفیت تو ان پر کبھی نہ گزری تھی۔ ایسا لگا گویا فاختہ کے گدگدے اور تپتے ہوئے پروں میں دھنس گئے ہوں۔ وہ بستر سے اُٹھ گئے۔ منی اور ارشد کمرے کے باہر کھیل رہے تھے۔ اُنھوں نے بڑی سہمی ہوئی آواز سے پکارا:۔

"اے منی۔ اے ارشد۔ ذرا ادھر تو آؤ۔"

منی بھاگتی ہوئی آئی اور آنکھوں پر سے بال ہٹاتی ہوئی بولی:۔

"ہمیں بلایا ابا میاں؟"

"بیٹی تم میرے بستر پر سوئی تھیں!" اُنھوں نے حد درجہ رازدارانہ لہجے میں پوچھا۔

"نہیں جی۔ ہم تو جب سے باہر کھیل رہے ہیں۔"

"اچھا تو شاید ارشد سویا ہوگا" اور اُنھوں نے ارشد کو پکارا۔ "واہ جی۔ ہم تو ایکساں منی

کے ساتھ کھیل رہے تھے۔ ہم نے تھوڑے ہی دھرے میں گندے پیر آپ کے بستر پر۔ ہاں آپا ابھی ابھی سو کے اُٹھی ہیں۔"

شبیر میاں سن ہوگئے۔! بستر پر مچلتی ہوئی خوشبو نے اُنھیں آپ ہی بتا دیا تھا:۔ میں مینا کے پاس سے آئی ہوں!

انھیں یاد آیا، ممانی بی سدا مینا کے لئے چکی میں خوشبودار مصالحے پسوایا کرتی تھیں۔ اور مینا ہمیشہ صابن کی بجائے مصالحوں سے نہاتی ہے۔ تبھی تو اس کے بال اتنے لمبے لمبے ہیں اور چلنے میں اس کے پاس سے نئی نویلی دلہنوں کی سی خوشبو آتی ہے۔

گول پیچ دار زینے پر مانوس سی کھٹ کھٹ سنائی دی اور پھر بڑی باریک سی ملائم سی میٹھی آواز آئی۔

"اے خانساماں کھانا لگا دو۔ میاں آگئے۔"

آج شبیر میاں کو یہ آواز بالکل نئی لگی، لہجہ بالکل نیا لگا اور وہیں بیٹھے بیٹھے الجھتے رہے۔ "اے خانساماں کھانا لگا دو۔ میاں آگئے،" ممانی بی مینا کو کئی بار ٹوک چکی تھیں کہ "اے بٹیا اپنے سے بڑوں کو رشتہ لگایا کرتے ہیں،" مگر جہاں جہاں بھی رشتہ لگانے کا موقع آیا مینا کی زبان ہکلا گئی۔

شبیر میاں ممانی بی کے سگوں میں سے ہوتے تھے۔ ایسا بہت دور کا رشتہ بھی نہ تھا۔ شادی ہوئی تو دوہرا رشتہ ہوگیا۔ بھانجے لگتے تھے اور ممانی بی، ممانی بی کہتے کہتے منہ سکھاتے تھے۔ ممانی بی کو بھی ان سے بڑی محبت تھی۔ کوئی کار ہو، کوئی کاج، ہر کام میں شبیر میاں کی رائے لی جارہی ہے، شبیر میاں بلائے جا رہے ہیں۔

جہاں کوئی اچھی چیز پکی رکابیوں میں لگا، سرپوش ڈھک، جھٹ سے نصیبن بوا کے حوالے کشتی کی کہ "جا جلدی سے شبیر میاں کے ہاں پہنچا آ۔"

شبیر میاں بھی ممانی سے ایسے گھلے ملے تھے کہ ماں سے بھی اتنی نہ رہی ہوگی۔ اور جب سے تو ان کی جاگیر کا قصہ ختم ہوا تھا یہ اپنا گاؤں چھوڑ کر یہیں آ بسے تھے۔ ممانی جی کے ہی پڑوس میں چھوٹا سا مکان تھا، وہیں رہتے۔ شادی شدہ تھے، شریف خاندانی بیوی تھی، دو بچے۔ مزے سے کٹ رہی تھی۔ اپنے کام کاج سے فرصت پاتیں تو رفیعہ بیگم بھی گھڑی دو گھڑی کو ممانی کے پاس آ بیٹھتیں۔ مینا سے ان کی بڑی دوستی تھی۔ دل سے دل ملنے میں کیا دیر لگتی ہے؟ یہ تیس کے اندر تھیں اور مینا تو سولھویں، سترھویں میں ہی تھی، پھر بھی دونوں ایسی گھلی ملی تھیں گویا ساتھ کی کھیلی سہیلیاں۔ گھنٹوں سر جوڑے بیٹھی باتیں کرتی رہتیں۔

مینا کو شہر سے افسر کا پیام آیا تو انہی کی کوششوں سے ہی نہ، ہوئی تھی۔ اب لاکھ ممانی بی

کہتی ہیں :۔

"واہی ۔ اچھا کماؤ لڑکا ہے، گن کا، ڈھنگ کا، اب اور کیا دیکھیں گے؟" گر رفیقہ کی ایک نہیں تو لاکھ نہیں ۔ ممانی بی نے کہا بھی :۔

"تم ایسی جنم جنم کی دشمن کاہے سے ہو گئی ہو، لڑکی کی کہ منہ توڑ انکار کئے جاتی ہو۔" ہنس کے بولیں ۔ " اے ممانی بی! ہماری مرضی نہیں تو آپ کیوں مجبور کریں ہیں ۔"

اصل میں مینا کی مرضی نہ تھی ۔ کیوں نہیں تھی؟ بس نہیں تھی؟ اُڑتے اڑتے اتنا ضرور سُنا کہ صاحبزادے ذرا رنگین مزاج ہیں۔ ممانی بی اتنی روشن خیال بھی نہ تھیں کہ بیٹی کے منہ سے د نہیں، سُن سکیں، اس لئے رفیعہ بیگم نے اپنی طرف سے توڑ جوڑ کر کے بات بنادی۔ ممانی بی کھٹک گئیں ۔ سوچا: اپنی طرف سے تو یہ زورا زوری سے کہہ نہیں سکتی، ہو گی دونوں کی ملی بھگ خاموش رہ گئیں ۔

ویسے سچ بات تو یہ تھی کہ ممانی بی اتنی لکیر کی فقیر بھی نہ تھیں ۔ انھوں نے تو آپ ہی بہت سی دیواریں گرادی تھیں ۔ "عصمت" تو خیر بہت زمانے سے آتا تھا ۔ اب تو رسالوں کی ڈور بند گئی تھی ۔ جہاں کسی نئے پرچے کا نام سُنا اور مینا نے چندہ بھیجا ۔ اتنا یقین تو انھیں بیٹی پر ضرور تھا او سیدھی کتابیں تو خیر مینا نے نہیں پڑھیں ۔ مگر یہ انہونی ضرور کر دکھائی کہ ایک مضمون ضرور لکھ ڈالا ۔ اب نصیب ہی اوندھے ہوں تو کوئی کیا کرے؟ وہ چھپ بھی گیا ۔ سارے خاندان میں وہ لے دے ہوئی کہ ممانی بی سے تو منہ چھپانا بھی تو نہ بن سکا ۔ پانی ایک ہی بار زو توڑ کے راہ بنالے تو پھر تو سبھی جگہ سے بہتا چلا جاتا ہے ۔ پہلی بات تھی، سبھوں میں دھوم سی ہو گئی مگر اب بعد میں تو یہ عالم ہو گیا کہ مینا نے باقاعدہ انگریزی بھی پڑھ ڈالی ۔ بہشتی زیور اور دینی مسائل تو پڑھے ہی پڑھے تھے، اُلٹے سیدھے ناول، کہانیاں بھی پڑھنی شروع کر دیں ۔ سب سے پہلے جو کتاب گھر میں آئی "دولت پر قربانیاں" تھی ۔ پھر تو گویا کھلی چھٹی ہی مل گئی ۔

مگر اب اُلٹے سیدھے ناول پڑھنے کا یہ بھی مطلب نہیں ہے، سرے سے ناک کاٹ ڈالی ماں باپ کی ۔ مگر ہاں اپنا مستقبل ضرور بنا لیا ۔ ساتھ ہی ساتھ پرانی باتوں کا توڑ بھی اسی نے توڑا ۔ چار کلی کے کھڑے پائنچوں کے پاجاموں اور بند گلے کی کرتیوں کی بجائے وہ ساڑی پہنتی تھی کانوں میں ممانی بی کے جہیز کی بالیاں تو اس نے سرے سے پہنیں ہی نہیں ۔ جگمگ جگمگ کرتے ٹاپس پہنتی تھی، جھکا جھول چندن ہار اور چوسری کی بجائے گلے میں ہلکا پھلکا نکلس ڈال لیتی ۔ اور یہ بھی روز روز نہیں ۔ کسی کے ہاں آنا جانا ہوا تو ماں کے اصرار پر پہن لیا، نہیں تو وہی اپنے بھونڈے ہاتھ، بھونڈا گلا ۔ آنے جانے والیاں ٹوکتیں بھی :۔

"اے کنواری اور سہاگن سے ہی گھر کی رونق ہے۔ یہ ٹھونٹھے ہاتھوں کی کیا چال اُٹھائی ہے بی؟" یہ مسکرا کر رہ جاتی۔ خاندان والے تو علی الاعلان کہتے کہ "اے بی بڑی بیگم نے تو لونڈیا کو کھلی چھٹی دے رکھی ہے۔"

گھپ اندھیرے میں زور دار اجالا گھس پڑے تو آنکھیں پہلے تو مچ مچ کرنے لگتی ہیں اور پھر اسی چھکا چھک اجالے کی عادی ہو جاتی ہیں۔ ممانی بی کو تو احساس ہی نہ ہوتا تھا کہ واقعی ان کی بیٹی اور خاندان والیوں سے اُتم ہے۔

ممانی بی کے میکے میں، اور اب یہاں سسرال میں بھی اتنا سخت پردہ تھا کہ مردوں کی تصویر تک دیکھنا گویا پردہ توڑ دینے کے برابر تھا۔ مینا کو بھی حسب قاعدہ سب سے پردہ کرایا جاتا۔ مگر اس نے جو ادھر ہاتھ پاؤں اُچھالے تو سبھی جڑیں کاٹ پھینکیں۔

رفعیہ بیگم کا زچہ خانہ ہونے والا تھا۔ دردوں سے بے حال پڑی تھیں، ڈاکٹر، لیڈی ڈاکٹر کا تو کدھر گزر ہوتا، محلے کی دائی کو بلایا گیا۔ وہ بھی آخر کو اناڑی نکلی۔ کچھ سمجھ پڑا، کچھ نہ پڑا۔ اس نے آڑے ٹیڑھے ہاتھوں سے کچی زچہ کو ایسے جھنجھوٹے دیے کہ اُلٹے لینے کے دینے پڑ گئے۔ بڑی تجربہ کار بوڑھیاں بھی ہاتھ مل کر رہ گئیں۔ ممانی بی کو بھی کچھ نہ سُوجھا۔ مینا اپنے گھر ہی پر تھی۔ کنواری بالی چھوکریوں کا ایسے موقعوں پر کام بھی کیا؟ مگر شبیر میاں کو تو معلوم تھا کہ بٹیا کافی لکھ پڑھ گئی ہیں۔ چھنو خالہ کا بیٹا حوض میں گر پڑا تھا تو اُنھوں نے اوندھا لٹا کر سارا پانی نکلوایا تھا۔ مہتو ماں کو سانپ نے کاٹا تو یہ اثر زائل ہونے تک نیم کی پتیاں بار بار چبواتی رہیں۔ ممکن ہے رفعیہ بیگم کو بھی کوئی دوا لگ جائے۔ اے مان لیا کہ ڈاکٹرنی نہیں تھیں، پھر بھی تھوڑی بہت دوا دارو دینی آتی ہی تھی۔

دوڑے دوڑے آئے۔ وہیں پردے کے پاس کھڑے کھڑے نصیبن بوا سے کہلوایا:۔

"چھوٹی بی بی سے کہیو بیوی کی طبیعت اچھی نہیں۔" ساری بات پوری ہونے سے پہلے ہی نصیبن بوا چیخ اُٹھی! "اے میاں تمہاری عقل سلامت ہے؟ بالی چھوکری.....؟"

بات پوری ہونے سے پہلے ہی مینا خود دروازے تک پہنچ گئی اور وہیں سے بولی:

"میری اپنی ذاتی رائے یہ ہے کہ آپ فوراً کسی لیڈی ڈاکٹر کو بلوا بھیجئے۔" اور ایک ڈاکٹرنی کا پتہ بھی بتا دیا۔

شبیر میاں اُلٹے پاؤں واپس ہوئے۔ جانے کیا بات یاد آئی تو پھر لوٹ کر آئے، آواز دی اور کہا:۔

" میں تو یہ بھول ہی گیا تھا کہ وہ فیس کیا لے گی!" ابھی یہ بات منہ میں ہی تھی کہ پھر بولے
اور فیس کا کیا ہے! جان سے بڑھ کر تو پیسہ نہیں ہوتا، اللہ جانے وہ آتی ہے یا نہیں؟ پھر میں کیا
کروں گا؟"
اور اُن کی آواز بھرا گئی۔ لاکھ آدمی ضبط کرے مگر بیوی کا ساتھ کچھ ایسا کچا بندھن تو ہوتا
نہیں۔ اب یہ اور بات ہے کہ ان کی بیوی ان کا کہنا ذرا کم مانتیں اور بات پیچھے منہ کو منہ دیے چلی
جاتیں۔ کہنے والے کہتے ہیں کہ یہی منہ چار سے اُٹھاتا ہے اور یہی منہ چار میں بٹھاتا ہے، مگر اب یہ
بات بھی نہ تھی کہ اتنی اتنی سی باتوں کو لے کر وہ کھڑے کھڑے کہہ دیتے کہ " جاؤ بی بی میں نے
تین بار تمہیں طلاق دی۔"
میاں بیوی کی زندگی بچوں کا کھیل تو ہوتی نہیں کہ جب دل بھر گیا ایک نے سب کو مخاطب
کر کے کہہ دیا۔ " کھیل ختم پیسہ ہضم۔" ایسا تو نہیں ہو سکتا کہ بغیر دھویں کے لکڑی جلے۔
مینا کو بھی خیال آگیا کہ اللہ جانے وہ انکار ہی کر دے۔ پھر کیا ہوگا؟ لپک کر باہر ہی تو
نکل آئی اور بولی:۔
" چلیے دونوں مل کر اُسے بُلائیں۔" اور اسی جھپاکے میں وہ شبیر میاں کے ساتھ ہو گئی۔
شبیر میاں کی بی بی کی زچگی بھی گئی، چلہ بھی نہا لیا، بات پرانی پڑ گئی، مگر خاندان والوں نے
کیا کیا بہتان نہیں باندھے؟ لیکن مینا نے ذرا شکن نہ چڑھائی۔ ممانی بی نے البتہ دو چار دن بیٹیا
سے بول چال ضرور بند کر رکھی۔ مگر پیٹ کی اولاد سے کوئی منہ پھیرے بھی تو کب تک؟ اب تو شبیر میاں
کا آنا جانا بھی شروع تھا اور مینا بھی سامنے آتی تھی۔ سلام کرنے کو ہاتھ اُٹھاتی مگر منہ سے کچھ نہ بولتی
بس چاندی کا بنجہ چاند ایسے ماتھے سے جڑ جاتا۔ ممانی بی ہنس کر پیار سے ڈانٹتیں بھی:۔
" پڑھ لکھ کر بالکل چین بدل دیا۔ یہ بھی کوئی سلام ہوا۔" مینا ہنس پڑتی
رفیعہ بیگم کی زچگی بڑی مشکلوں سے ہوا کرتی۔ پہلا بچہ تو جیسا ہوا، ہوا۔ دوسرا اپنے وقت
کا قیصر تھا۔ ڈاکٹرنی صاف کہہ گئی تھی کہ اب کے بچہ ہوا تو جان کا خطرہ ہے۔ مگر ڈھائی دو برس پیچھے
پھر رفیعہ بیگم امید سے رہیں۔ اور اب کے جو زچگی کا وقت آیا تو بچہ بھی ضائع ہوا اور ماں بھی۔
شبیر میاں بھری پُری دنیا میں تنہا رہ گئے۔
چہلم پر ممانی بی نے بہت آنسو بہائے۔ دل تو شبیر میاں کے لئے بہت ہڑک رہا تھا مگر
کرتی بھی کیا بیچاری؟ جوان بیٹی کا ساتھ تھا اور ہر ایک کے پیچھے شیطان لگا ہے دنیا دکھاوے کو منہ
سے کہا بھی کہ، " میاں اب تو دیکھ بھال والا کوئی نہیں ہمارے یہاں اُٹھ آؤ نا۔" مگر شبیر میاں بھی
ان کی مجبوری کو سمجھتے تھے، سر ہلا کر انکار کر دیا

میناکو اس پر بڑا ترس آتا۔ بیچارے اول ہی تو اللہ میاں کی گائے تھے۔ اب تو بالکل ہی موم ہو کر رہ گئے تھے، دونوں بچے الگ ڈھائیں ڈھائیں پھرتے، مینا ہاتھ پکڑ کر منہ ہاتھ دُھلا دیتی، ناشتے کے وقت آتے تو ساتھ بٹھالیتی۔

ایک دن شبیر میاں بھی آئے بیٹھے تھے۔ دونوں بچے بھی ساتھ تھے۔ ممانی بی نے ہیر پھیر سے ذکر چھیڑا:۔ "اے میاں لوگ تو کہتے ہیں بیوی کی موت کہنی کی چوٹ ہوتی ہے۔ لگتی بڑے زور سے ہے مگر ذرا دیر میں درد غائب۔ تم کب تک یوں ہی رہو گے؟ ماشاء اللہ خود بھی جان جوان ہو، ننھے ننھے بچے ہیں، کوئی بھی تو ہو دیکھ بھال کرنے والا۔"

شبیر میاں بولے:۔ "ممانی بی رنج و غم کی بات تو جانے دیجیئے، میں سوچتا ہوں آنے والی بچوں سے سگی ماں سا برتاؤ نہیں کر سکے گی، اور میں یہ سب برداشت نہیں کر سکوں گا۔" اُن کی آواز بھیگ سی گئی۔ پھر ٹھہر کر بولے:۔ "کیا گھر کا گھروا ہو گیا ممانی بی۔ اب تو دھول اُڑتی ہے ہر طرف۔ باہر سے آؤں تو کوئی منہ دُھلانے والا نہیں۔ پانی وانی کی ضرورت پڑے تو خود اُٹھ کر لوں تو لوں، ورنہ کوئی اس کا بھی روادار نہیں، پیاس ہی بجھا دے۔ بچے الگ تباہ حال!"

مینا کا دل اندر سے پگھل اُٹھا، بولی:۔

"آپ ہمارے یہاں آجائیے نا۔ یہاں اماں بھی ہیں، بچوں کا جی بھی بہل جائے گا۔"

"میں آ تو جاؤں، مگر۔۔۔۔"، شبیر میاں کی زبان گنگ ہو گئی۔ ممانی بھی بات کا رخ دیکھ کر خاموش رہ گئیں۔ مینا پھر بولی: "خاندان والوں سے ہی ڈر رہے ہیں نا آپ؟ اپنے کام سے کام رکھیئے۔ کتوں کا کام بھونکنا ہے، بھونکتے ہی رہتے ہیں۔"

تھوڑی دیر یوں ہی ہاں ہاں ہوتی رہی، پھر ممانی بی نے بھی زور دیا تو شبیر میاں اُسی دن اُٹھ آئے۔ مینا کا وقت اب بڑا اچھا کٹ رہا تھا۔ تمام دن بچوں میں الجھی رہتی۔ بچے بھی ہل مل گئے تھے۔ اپنی ماں کو بھول کر بھی یاد نہ کرتے۔ کبھی کبھار ایسے ہی مینا کے جسم پر کوئی خوبصورت سا کپڑا یا زیور دیکھ لیتے تو کہتے:۔

"امی جی بھی ایسا ہی کرتا پہنتی تھیں۔"

"ہماری امی کے پاس بھی ایسا ہی ہار تھا۔"

شبیر میاں گھر میں رہتے ضرور، مگر یوں، جیسے رہتے ہی نہ ہوں۔ نہ چیٹ نہ پٹ۔ کبھی اونچی آواز سے بولتے، نہ قہقہہ لگا کر ہنستے۔ ممانی بی جس ڈر سے اُنھیں اپنے گھر بلانے سے ڈرتی تھیں وہ بالکل ناممکن سی بات تھی۔ ایسے بھولے بھالے تھے کہ بھولے سے بھی مینا کو آنکھ بھر کر نہ دیکھتے۔

ایک دن باتوں ہی باتوں میں ممانی بی بولی تھیں: "بچپن میں میری بٹیا مینا کی طرح چہکتی تھی، بس میں

نے بھی نام ٹوال دیا۔" اس پر شبیر میاں نے آنکھیں اُٹھا کر ضرور دیکھا اور بڑی سادگی سے بولے:

" واقعی اچھا نام دیا آپ نے۔ مینا بڑی پیاری ہنسی ہنستی ہیں۔"

مینا کے چم چم چمکتے دانت گلابی گلابی ہونٹوں میں چھپ گئے۔ اتنی سادگی سے جو اتنا بڑا سچ کہہ دے تو اس سے کوئی خطرہ نہیں ہو سکتا۔ شبیر میاں کے لہجے میں کوئی گہرائی نہ تھی۔

بڑے نانا کہتے تھے کتوں کا رونا بڑا نحس ہوتا ہے۔ کتّے کے رونے کی آواز آئے تو صدقہ دلوا دینا چاہیئے۔ اس رات رہ رہ کے کتے بھونکتے رہے۔ اور صبح ہی صبح نصیبن بولے تازہ تازہ دودھ ابالنے کے لئے چولہے پر چڑھایا تو آپ ہی آپ پھٹ گیا۔ نصیبن بوا زمانہ دیکھے ہوئے تھیں۔ منہ سے کچھ نہ بولیں، مگر ہولی کی دہائی مانگنے لگیں۔ چار دن کی بیماری میں حمانی بی چٹ پٹ ہو گئیں۔ اور مینا! مینا سے الّو بن گئی۔ اندھیاروں میں چھپتی روتی پھرتی۔ بستر پہ اوندھے منہ پڑی پڑی سسکیاں لیتی رہتی۔ جیسیوں ہی تو پیام اچھے بُرے آئیں ہوں گے، مگر ماں کو پسند نہ آئے۔ اور جو ماں کو پسند آیا، بیٹی کو ناپسند ہوا۔ بیٹی کے بیاہ کا ارمان جی کے جی ہی میں لے گئیں۔ اب تو خاندان والوں کو موقع ہی مل گیا۔ جہاں دیکھو وہاں مینا اور شبیر میاں موضوع بنے ہوئے ہیں۔ اوندھی سیدھی، جھوٹی سچی، ہزاروں ہی باتیں اڑائی گئیں اور مینا ہول ہول جاتی۔ باپ کا سایہ تو مدت ہوئی اُٹھ چکا تھا، ماں چھاؤں بن کر سہارے بیٹھی تھیں، وہ بھی چل دیں۔ روپے پیسے کی کمی نہ تھی، مگر روپے پیسے ہی سے سب کام تو نہیں چلتے!

بولنے والے بھی کہاں تک بولتے۔ تھک ہار کر خود ہی چپ رہ گئے۔ شبیر میاں اب بھی مینا کے یہاں ہی رہتے۔ باہر سے آتے ہی سیدھے اپنے کمرے میں پہنچ جاتے۔ گرمی کے دن ہوتے تو دالان میں نظر آتے۔ مونڈھا بچھا ہوا، اخبار منہ سے لگا ہوا۔ سردیوں اور بارشوں میں تو اتنا بھی نہ ہوتا۔ ان کے آتے ہی گول پیچ دار زینے پر مانوس سی کھٹ کھٹ سی ابھرتی، اور پھر نرم نرم سی میٹھی آواز:۔

" اے خانساماں کھانا لگا دو۔ میاں آ گئے۔"

شبیر میاں اور مینا اسی زندگی کے عادی ہو گئے۔ نہ ان کے دل میں ان کے لئے کوئی جگہ بنی، نہ اُنھوں نے ان کو اپنے دل پر چڑھایا۔

ایک دن ارشد اپنی آنکھیں کھجلاتا ہوا آیا اور منمنا کر بولا: " ہماری آنکھوں میں کھجلی ہوتی تھی تو امی کاجل لگا دیتی تھیں۔"

" ارے رے۔" مینا نے اُسے پیار سے گود میں اُٹھا لیا۔ " تو بھی مجھ سے پہلے ہی کیوں نہ کہا۔ میں نہ بنا دیتی اپنے راجہ گڈے کے لئے کاجل؟"

مینا نے سکوری بھر کے ارنڈ کا تیل شیشی سے انڈیلا۔ روئی کو بل دے کر بتی بنائی اور کونے میں چراغ سا بنا کر اوپر سے مٹی کا ایک پیالہ اوندھا دیا گھنٹہ بھر کے بعد یہ اتا بڑا سا کاجل جم گیا۔ مینا نے ڈبیہ میں کاجل پکڑا اور منے کو گود میں بٹھا کر اُس کی آنکھوں میں سلائی پھیرنی چاہی۔

"اُں ہاں۔ امی کہتی تھیں آنکھوں میں ادہانہیں پھیرنا چاہیے" مینا ہنس پڑی۔

"اچھا تو انگلی سے لگا دیں!"

"ہاں" ارشد نے سر ہلایا۔

مینا نے ارشد کی دونوں آنکھوں میں اُنگلی پھیری۔ تھوڑا کاجل پھر بھی انگلی پر لگا رہ گیا۔ وہ اُس نے اپنی آنکھوں میں بھر لیا اور بھول بھی گئی کہ کاجل لگایا تھا۔

شام کو شبیر میاں آئے۔ گول پیچ دار زینے پر مانوس قدموں کی کھٹ کھٹ سنائی دی۔ پھر میٹھے لہجے میں آواز آئی:۔

"اے خانساماں کھانا لگا دو۔ میاں آگئے"

دستر خوان پر بیٹھے تھے کہ ارشد مینا کا ہاتھ پکڑ کر گھسیٹتا ہوا لے آیا۔

"ابّا میاں آپا نے آنکھوں میں کاجل لگا دیا ہے۔ دیکھا آپ نے"

"ہاں۔ ہاں بڑی اچھی ہیں تمہاری آپا" اور وہ اسی انہماک سے کھاتے رہے۔ کھانے کے بعد دالان میں نکل کر مونڈھے پر بیٹھے تھے کہ مینا آگئی۔ اخبار دیتے ہوئے بولی:۔

"ذرا پڑھنے کے لئے لے گئی تھی۔ معاف کیجئے بغیر پوچھے ہی اُٹھا لیا" شبیر میاں نے اس کی طرف دیکھا۔ اُس کی معذرت پر کچھ کہنا چاہتے تھے، مگر اک دم رک کر سادگی سے بولے:۔

"ارے میں نے کبھی غور ہی نہیں کیا۔ مینا تمہاری آنکھیں کتنی خوبصورت ہیں" اور اخبار لے کر یوں پڑھنے میں منہمک ہوگئے گویا کسی لڑکی کی خوبصورت آنکھوں کی تعریف نہ کی ہو، موسم کی تعریف کی ہو۔

"واہ بھئی۔ کیا اچھا موسم ہے!"

مینا بوکھلا کر اُلٹے پاؤں بھاگی، اُس کا پیر ساڑی سے الجھ گیا اور وہ گر پڑی۔ شبیر میاں نے لپک کر اُسے اُٹھایا۔ نرم نرم، گرم گرم پروں والی فاختہ گویا ہاتھوں میں آگئی۔

سادگی سے بولے:۔

"ذرا سنبھل کر نہیں چلتیں، ابھی ہڈی چورا ہوگئی ہوتی!" اور اُٹھاتے میں مینا کا سر ان کی ناک سے اتنی قریب ہوگیا کہ بھینی بھینی سی خوشبو سے ان کا پورا وجود مہک مہک گیا۔

شبیر میاں نے اس دن اخبار پڑھا ضرور، لیکن کوئی اگر پوچھتا: "سناؤ میاں آج کی خاص خبر کیا ہے؟" تو وہ سٹ پٹا کے رہ جاتے۔

مینا تین دن سے کھانسی نزلے میں پڑی گھل رہی تھی۔ شبیر میاں کو تین دن سے وہ مانوس کھٹ کھٹ سُنائی نہ دی تھی۔ اُنھوں نے چاہا خبر لینے کو جائیں، مگر پھر ارادہ ترک کر دیا۔ جانے کا ارادہ کرتے تو لگتا کہ نرم نرم پروں کے ڈھیر میں دھنسے جا رہے ہیں۔ گھبرا کر وہ باہر نکل آئے۔

"اونہہ! زکام بھی کوئی بیماری ہوئی بھلا۔ آپ ہی ٹھیک ہو جائے گی۔"

ایک دفعہ وہ بخار میں بھن کر اُٹھ کھڑے ہوئے تھے تو مینا نے اُنھیں مشورہ دیا تھا:۔

"آپ شادی کیوں نہیں کر لیتے؟ آخر کوئی دیکھ بھال والا بھی تو ہونا چاہیے!"

اب اُنھیں خیال آیا یہ مینا شادی کیوں نہیں کر لیتیں؟ آخر کوئی دیکھ بھال والا بھی تو چاہیے نا"

پھر اُنھیں مینا اور ممانی بی کے احسان یاد آ گئے۔ اُنھوں نے دل میں تہیہ کر لیا کہ مینا کے لائق بَر ڈھونڈ نکالیں گے۔ مینا جو اتنی پیاری، اتنی خوبصورت، اتنی سگھڑ، اتنی تعلیم یافتہ ہے، اس کے جوڑ کو جوڑ تو ملے۔ مینا کا دل کتنا نرم تھا۔ کئی بار وہ اس کی آنکھوں میں نمی دیکھ چکے تھے۔ بچوں سے باتیں کرتے کرتے وہ رفیعہ بیگم کی یاد میں آنسو بہانا شروع کر دیتی۔ بچوں سے اتنی ہل مل گئی تھی کہ رفیعہ بیگم کی کمی بھلا دی بچّے اب صاف ستھرے رہتے۔ روتے، بسورتے نہ تھے اور صورت پر بہار آ گئی تھی۔

"لاحول ولا" شبیر میاں نے سوچا، میں بھی کتنا کورا اخلاق ہوں کہ وہ تو مجھ سے، میرے بچوں سے اتنی ہمدردی کرے اور میں اس کی خبر تک نہ لوں۔ اخبار مونڈھے پر رکھ کر اُٹھے اور مینا کے کمرے کی طرف چلے۔

مینا نے سردی کے مارے سوئیٹر چڑھا لیا تھا۔ اب تو گرمی ہوئی تو اُسے اُتار پھینکنا چاہا۔ سوئیٹر کھلے گلے کا نہ تھا۔ گردن میں سے اُتارنا چڑھانا پڑتا۔ دروازے کی طرف پیٹھ کر کے ساڑی کا آنچل دونوں گھٹنوں میں دبا کر وہ پیٹھ کے بل جھکے جھکے زور لگا کر سوئیٹر اتار رہی تھی۔

شبیر میاں روایتی کانچ کی جوتی اور بالوں کی سنہری لٹ دیکھ کر اندھا دھند عاشق ہو جانے والے شہزادوں میں سے تو تھے نہیں، مگر میاں ایک جگمگاتی صبح دیکھ کر گھبرا اُٹھے۔ ڈھیر سارے نرم گرم پروں میں ان کو اپنا وجود ڈوبتا ہوا محسوس ہوا اور وہ ہڑبڑا کر لوٹ گئے۔

مینا نے قدموں کی چاپ سن کر بمشکل سوئیٹر کھینچ کر پھینکا اور دیکھا تو شبیر میاں سر نہوڑائے جلدی جلدی چلے جا رہے تھے۔

تین دن سے تو بخار ہی تھا۔ تین دن مینا نے یوں ہی کمرے میں کاٹ دیئے۔ ہمت نہ پڑتی تھی کہ باہر نکلے۔ ساتویں دن اپنے کمرے سے باہر آئی تو سہی، مگر شبیر میاں سے یوں لجائی لجائی جیسے نئی نویلی دلہن سسرال دکھاوے کو دولہا سے شرمائے اور موقع ملنے پر رہ رہ کے کن انکھیوں سے دولہا کو دیکھی جائے۔

شبیر میاں چپ چپ سے تھے۔ آگے بھی انھیں یہ خوشبو اپنے تکیے پہ، بستر پہ مل چکی تھی، جو اپنے منہ سے کہتی تھی :-

"میں مینا کے پاس سے آئی ہوں"

اب مینا اتنی گئی گزری نہ تھی کہ کسی کے بستر پہ لوٹیں لگاتی پھرے۔ منی اور ارشد سونے کے لئے کمرے میں جاتے تو اُسے بھی گھسیٹ لیتے۔

"آپا ہمیں ڈر لگتا ہے نا۔ آپ بھی ہمارے ساتھ چلئے"

تب تک وہ سوئیں سوئیں، یہ بیٹھی کتابیں ٹٹولتی رہتی۔ کبھی کبھار پیٹھ سیدھی کرنے کو شبیر میاں کے بستر پر لڑھک جاتی۔ انھیں کا پلنگ اس وقت خالی ہوتا تھا۔

بدلی چھائی، برس گئی۔ آسمان پھر نیلا نیلا، دھلا دھلا تھا۔ وہی شام کی واپسی، وہی بچوں کی شرارت، وہی مینا کی کھنکتی ہوئی ہنسی اور گول پیچ دار زینے پر مانوس سی کھٹ کھٹ کے بعد نرم، ملائم گھلی گھلی سی آواز :-

"اے خانساماں کھانا لگا دو۔ میاں آگئے"

جاتے جاتے ایک دن شبیر میاں کہہ گئے :-

"مینا ان کپڑوں کو ذرا دھوپ دکھا دینا، کیڑا نہ لگ جائے"

اس دن تو مینا سے نہ ہو سکا۔ دوسرے دن صبح ابھی شبیر میاں گھر ہی پر تھے تو سارا سامان لے کر بیٹھ گئی۔ کپڑوں کے صندوق میں زیورات کی صندوقچی بھی نکلی۔ بچے بھی آ جھکے۔ صندوقچی کھول کے یوں ہی مینا بیٹھ گئی۔ سامان اُلٹ پلٹ کرنے لگی۔ صندوقچی بھری پُری تھی۔ زیور سے لے کر افشاں تک بس جوں کی توں۔ بچے پاس بیٹھے اوندھی سیدھی باتیں کر رہے تھے۔ ایک بھی سوال انھوں نے اپنی ماں کے متعلق نہ کیا۔

مینا خود ہی بول اُٹھی :-

"امی کی یاد آتی ہے منے؟" ارشد اور منی ایک زبان ہو کر بولے :-

"اوں ہوں۔ آپ جو اتنی اچھی ہیں!"

"مگر میں امی کی برابری کہاں کر سکتی ہوں" وہ ہنس کر بولی۔ "اوں،" ارشد بولا، "ہم تو آپ کو اپنی امی سمجھتے ہیں!" مینا کا منہ لال ہو گیا۔ ہونٹ کانپ اُٹھے۔ اس کی آنکھوں کے کونے گیلے گیلے ہو گئے۔ بڑی مشکل سے مسکرا کر بولی :- "سچ؟"

"ہاں اور کیا!" ارشد بولا

مینا نے صندوقچی کا نچلا خانہ ٹٹولا۔ کالی پوت کا لچھا پڑا چمک رہا تھا۔ اس نے لچھا اُٹھا کر

مٹھی میں دبا لیا اور گھڑی کی طرف دیکھا۔ دس بجنے میں پندرہ منٹ تھے۔ روز اسی وقت شبیر میاں گھر سے باہر جاتے تھے۔

وہ تیزی سے لپکی۔ زینے کے پاس تھوڑی دیر رکی۔ مٹھی کھولی اور پھر دوڑتی ہوئی دروازے میں رک گئی۔ "سنئے—" وہ ٹھٹھک گئی۔

شبیر میاں بھی رک گئے اور اک دم چونک گئے۔ دھانی ساڑی میں اس کا ہلکا پھلکا جسم کانپا جا رہا تھا۔ ساڑی کے آنچل کا ایک کونہ پتلے پتلے ہونٹوں میں دبا ہوا تھا۔ آنکھیں جھکی ہوئی تھیں۔ پلکیں لرز رہی تھیں اور گوری گوری گردن میں سانسوں کے زیر و بم کے ساتھ ساتھ کالی پوت کا لچھا کانپ رہا تھا۔

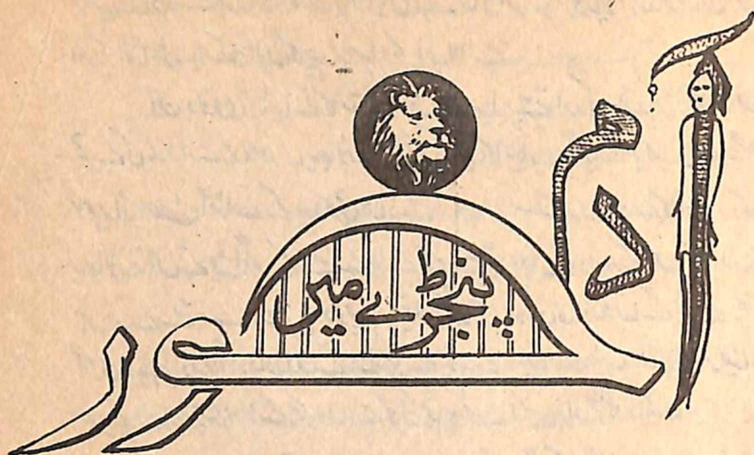
وہ اٹک اٹک کر بولی:۔

"سنگھار دان میں اور تو سب چیزیں ہیں۔ مگر مسّی نہیں ہے!" اور وہ منہ پلو میں چھپا کر شرما کر بھاگ گئی۔ شبیر میاں کے آس پاس نرم نرم فاختئی پروں کا ڈھیر سا لگ گیا اور وہ ڈوبتے ہی چلے گئے۔

شام کو جب وہ ہاتھ میں مسی کی دہری پوڑی سنبھالے گھر میں داخل ہوئے تو گول پیچ دار زینے پر مانوس سی کھٹ کھٹ ہوئی اور نرم ملائم سی، شکر میں گھلی ہوئی میٹھی آواز گونجی:۔

"اے خانساماں کھانا لگا دے۔ "وہ" آگئے ہیں!"

⁘ ⁘ ⁘ ⁘ ⁘



مقبول جہانگیر

۱۹۲۶ء کا موسم بہار میں نے سنگاپور میں گزارا۔ کیا بارونق اور خوبصورت شہر ہے۔ میرا دل چاہا کہ عمر کا بقیہ حصّہ اسی حسین شہر میں بسر کردوں، مگر ایسا نہیں کرسکتا۔ پیٹ کے دوزخ کی آگ بجھانے کے لئے اِدھر اُدھر مارا مارا پھرنا پڑتا ہے۔ چار دن بھی قرار سے بیٹھنے کا موقع نصیب نہیں ہوتا۔

بعض اوقات اپنی حالت پر غور کرتا ہوں تو ہنسی آتی ہے اور آسمان کی ستم ظریفی پر کبھی خون بھی کھول جاتا ہے۔ عمرِ عزیز کے تیس سال درندوں، پرندوں اور آبی جانوروں کو پکڑنے میں کٹ گئے۔ دنیا کے بڑے بڑے سرکسوں اور چڑیاگھروں میں یہ خاکسار شیطان کی طرح مشہور ہے اور کیوں نہ ہو؟ ہر چڑیاگھر اور سرکس میں میرے پکڑے ہوئے جانور موجود ہیں، شیر، چیتے، مگرمچھ، ہاتھی، گینڈے بن مانس، بندر، طوطے، قمریاں، مور، اود بلاؤ، ریچھ، جنگلی بلیاں، بھیڑیئے۔ تیندوے، مچھلیوں عقاب، اژدہے، سانپ، ملک ملک کے عجیب وغریب حشرات الارض اور خدا جانے کیا الا بلا۔

ان جانوروں کو پکڑنے کے لئے میں ایسی ایسی خطرناک جگہوں پر گیا ہوں کہ آدمی کا پتہ پانی ہوجائے۔ موت کے جبڑوں سے کتنی بار جان بچا کر نکلا، اس کا تو شمار ہی نہیں۔ بس یوں سمجھ لیجیے

کہ آپ کی دعا سے بڑی ہی سخت جان پائی ہے۔ جاوا، سماترا، بورنیو، ہندوستان، برما، افریقہ امریکہ اور آسٹریلیا کے جنگلوں کا چپہ چپہ میرا دیکھا بھالا ہے۔

اُن دنوں برما جانے کا مقصد صرف چند سیاہ چیتے اور کچھ بندر پکڑنا تھا۔ اپنے وسیع تجربے کی بدولت میں جلد ہی یہ جانور حاصل کرنے میں کامیاب ہوگیا۔ اور اب میں سنگاپور کے موسم بہار کا لطف اُٹھانے کے بعد بحری جہاز سے سان فرانسسکو روانہ ہونے کا ارادہ رکھتا تھا، کیونکہ یہ جانور وہاں کے چڑیا گھر کے لئے جانے تھے۔ پینتیس چالیس دن کے اس خطرناک بحری سفر میں میرے لئے سب سے زیادہ جو چیز پریشان کُن تھی وہ ان جانوروں کے پنجرے تھے۔ جی ہاں! لکڑی لوہے اور ٹین کی چادروں کے بنے ہوئے پنجرے۔ میں اچھی طرح اطمینان کر لینا چاہتا تھا کہ سفر کے دوران میں جہاز کے ہچکولوں سے کوئی پنجرہ ٹوٹ تو نہیں جائے گا۔ ایک مرتبہ ذرا سی بے احتیاطی کے باعث میں مرتے مرتے بچا تھا۔ قصہ یہ ہوا کہ کانگو کے جنگلوں سے میں نے ایک جوڑا بن مانسوں کا پکڑا تھا اور میں اس جوڑے کو لکڑی کے ایک بہت مضبوط پنجرے میں بند کر کے لندن لے جا رہا تھا۔ ایک رات سمندر میں زبردست طوفان آیا، جہاز میں رکھے ہوئے جانوروں کے پنجرے ایک دوسرے سے ٹکرا گئے اور اسی اثنا میں بن مانسوں کے پنجرے کی ایک دیوار کھنچ گئی۔ بس پھر کیا تھا! دونوں قوی ہیکل بن مانس آزاد ہو گئے۔ اتفاق دیکھئے کہ مجھے آخر وقت تک پتہ نہ چلا کہ وہ آزاد ہو چکے ہیں۔ میں جب پو پھٹتے معاینے کے لئے اس وسیع کمرے میں گیا جہاں پنجرے رکھے تھے، تو دروازہ کھولتے ہی دونوں بن مانس اُچھل کر اپنی جگہ سے اُٹھے اور میری جانب لپکے۔ میں اگر اپنے حواس برقرار نہ رکھتا، تو وہ دونوں آناً فاناً مجھے دبوچ کر مار ڈالتے۔ میں پنجروں کی اوٹ لیتا ہوا کھلے دروازے سے نکل گیا۔ بعد ازاں بڑی مشکل سے ہم نے اُنھیں دوبارہ پکڑ کر پنجرے میں بند کیا۔ اس طرح ایک بار ایک بڑا چیتا پنجرے سے آزاد ہوگیا تھا۔ لوہے کی سلاخیں کچھ ڈھیلی تھیں، چیتے نے زور لگایا اور سلاخیں علحدہ کر کے باہر نکل آیا۔ وہ پہلے بندروں کے پنجرے کی طرف گیا اور پنجے مار مار کر اُنھیں زخمی کر دیا۔ بندروں کی چیخیں سن کر میرے ساتھی وہاں دوڑے ہوئے گئے۔ اُنھوں نے چیتے کی غراہٹیں سُنیں۔ میں نے دو گھنٹے کوشش کے بعد چیتے کو بہلا کر ایک دوسرے پنجرے میں بند کر دیا۔

دراصل ان درندوں کے لئے پنجرے بنانا بھی ایک آرٹ ہے جو ہر بڑھئی کے بس کی بات نہیں ــــــ

بڑی تلاش کے بعد مجھے سنگاپور ہی میں ایک "فنکار" بڑھئی مل گیا، جس کا نام ہن ہونگ تھا۔ میری اور اس کی رفاقت سالہا سال تک رہی۔ اُسے بھی جانوروں سے دلچسپی تھی۔

اور آدمی سیر و سیاحت کا بڑا شائق تھا۔ نئے نئے ملک دیکھنے کے جنون میں وہ میرے ساتھ ہو لیا۔ اس کے پاس گنتی کے چند اوزار تھے جن کی مدد سے وہ ایسے عمدہ اور مضبوط پنجرے بناتا تھا کہ اس کی کاریگری پر مجھے حیرت ہوتی تھی۔ ہن ہونگ بڑا محنتی اور ہوشیار آدمی تھا۔ اس نے مجھے کبھی شکایت کا موقع نہیں دیا۔

سفر سے چند روز قبل کا ذکر ہے۔ میں سنگاپور کے ہوٹل ریفلز کے ایک آرام دہ کمرے میں بیٹھا تھا کہ یکایک ہن ہونگ وہاں آیا۔ اس کا چہرہ شدت جذبات سے تمتما رہا تھا۔ اُس نے آتے ہی کہا: —

"جناب، جلدی چلیئے۔ سلطان جہور آپ سے ٹیلی فون پر کوئی بات کہنا چاہتے ہیں۔"

میں حیرت سے اس کا منہ تکنے لگا۔ سلطان جہور میرا پرانا دوست تھا اور میں شکار کی کئی مہمات میں اُس کے ساتھ جا چکا تھا، لیکن اتنے سویرے وہ کس مقصد کے لئے مجھے فون کر رہا تھا؟ ضرور کوئی خاص بات ہے۔ یہ سوچ کر میں سیڑھیاں اتر کر نیچے کمرے میں گیا جہاں ٹیلی فون رکھا تھا۔ میں نے ریسیور کان سے لگایا:

"ہیلو، میں فرینک بول رہا ہوں۔"

"بھئی میں نے تمہیں بے وقت تکلیف دی ہے۔" اُدھر سے سلطان جہور کی جانی پہچانی آواز میرے کان میں آئی۔ "میں سوچ رہا تھا کہ اگر تم سفر پر روانہ ہو گئے تو بہت بُری بات ہوگی۔ قصہ یہ ہے کہ ایک آدم خور شیر نے بڑی تباہی پھیلائی ہے۔ کیا تم اسے زندہ پکڑ سکتے ہو؟ کل اس آدم خور نے جہور سے شمال کی جانب کوئی پچیس میل دور ربڑ کے درختوں کے جنگل میں ایک قلی کو ہڑپ کر لیا ہے۔ وہاں سیکڑوں مزدور کام پر لگے ہوئے ہیں، کیوں کہ ربڑ کی پیداوار کا موسم ہے، لیکن اس آدم خور کی وجہ سے ان سب میں دہشت پھیل گئی ہے اور وہ کام کرنے سے گریز کر رہے ہیں۔ میں نے فیصلہ کر لیا ہے کہ ایک فوجی افسر اور آٹھ دس سپاہیوں کو وہاں بھیج دوں تاکہ اس آدم خور کا قصہ پاک ہو جائے۔ پھر مجھے تمہارا خیال آیا۔ اگر تم اس کو زندہ پکڑ لو، تو تمہیں کوئی بھی چڑیا گھر اچھی خاصی رقم دے سکتا ہے۔ بولو کیا ارادہ ہے؟"

سلطان جہور نے ایک سانس میں یہ ساری باتیں کہہ ڈالیں۔ میں نے ایک لمحے کے لئے اس صورت حال پر غور کیا، معاملہ بے ڈھب تھا۔ میں نے بہت سے شیروں اور چیتوں کو گرفتار کیا تھا، لیکن آدم خور سے آمنا سامنا کرنے کی نوبت کبھی نہ آئی تھی۔ سلطان جہور نے شاید میری خاموشی سے اندازہ لگا لیا کہ میں اس مسئلے میں متذبذب ہوں۔ وہ فوراً بولا:

"دیکھو دوست، میں تم پر زور نہیں دے سکتا کہ تم ضرور ہی اس آدم خور کو زندہ پکڑو۔ اسے ہلاک

بھی کیا جا سکتا ہے۔ میں تو صرف یہ چاہتا ہوں کہ مزدوروں میں پھیلا ہوا خوف وہراس دور ہو جائے، اگر تم رضامند ہو، تو میں سپاہیوں کو تمہاری کمان میں دے سکتا ہوں۔"

"ہز ہائی نس، میں آپ کی اس توجہ کا شکرگزار ہوں"۔ میں نے جواب دیا۔ "اگرچہ اس سے پہلے آدم خور شیر کو زندہ پکڑنے کا اتفاق نہیں ہوا، تاہم میں یہ موقع میں ہاتھ سے جانے نہیں دینا چاہتا۔ آپ کی تجویز مجھے منظور ہے۔"

"خوب، خوب، مجھے اب اطمینان ہوا۔ بھئی بات یہ ہے کہ میرے سپاہی اور دوسرے لوگ شیر وغیرہ کے معاملے میں قطعی اناڑی ہیں۔ مجھے احساس تھا کہ یہ لوگ اسے مارنے میں آسانی سے کامیاب نہیں ہو سکتے۔ اب تم فوراً میرے قلعے میں آن کر مجھ سے ملو، تفصیلات تمہیں وہیں معلوم ہو جائیں گی۔"

یہ کہہ کر سلطان نے فون بند کر دیا۔ اپنے کمرے میں آ کر میں نے ہن مونگ کو بتایا کہ سلطان نے فون پر کیا کہا ہے، تو اس کا چہرہ دہشت سے سپید پڑ گیا۔ وہ دیر تک اپنی زبان پر کچھ کہتا رہا، کیونکہ وہ انگریزی روانی سے نہیں بول سکتا تھا۔ اسی روز دوپہر کو ریاست جہور کے عظیم الشان قلعے میں یہاں کے مسلمان بادشاہ سے میری ملاقات ہوئی۔ یہ قلعہ ریاست کے فوجی ہیڈ کوارٹر کی حیثیت سے بھی استعمال ہوتا ہے۔ سلطان نے میرا تعارف اپنی فوج کے ایک میجر سے کرایا۔ جو اس مہم میں میرا مددگار بننے والا تھا۔ وہ پستہ قد، لیکن گٹھے ہوئے جسم کا مالک تھا۔ پہلی نظر میں وہ مجھے ایک اچھا ملنسار آدمی معلوم ہوا۔ وہ وردی کی بجائے انگریزی لباس پہنے ہوئے تھا، جس کی اچھی تراش خراش سے اندازہ ہوتا تھا کہ لباس کے معاملے میں یہ شخص اچھا ذوق رکھتا ہے۔ اس کے ہاتھ میں اعشاریہ ۳۰۳ کی شاٹ گن تھی۔ سلطان نے مجھے بتایا کہ میجر اسی گن سے کئی شیر پہلے مار چکا ہے۔ میں نے اس کے بعد دوسرے سپاہیوں کو دیکھا، وہ سب خاکی وردی پہنے ہوئے تھے اور کافی چاق چوبند نظر آ رہے تھے۔ انھوں نے سروں پر ملایا کی جانی پہچانی نشانی سیاہ ٹوپیاں پہن رکھی تھیں۔

میجر نے مجھے بتایا کہ موٹر تیار ہے، اس لئے ہمیں فوراً موقعۂ واردات پر پہنچنا چاہئے میری ہدایت کے مطابق سلطان نے حکم جاری کر دیا تھا کہ جس قلی کو شیر نے ہلاک کیا ہے اُس کی لاش جس جگہ پڑی ہے، وہیں رہنے دی جائے۔ اور کوئی شخص اسے وہاں سے ہٹانے کی کوشش نہ کرے۔

جہور سے ربڑ کے اس وسیع جنگل تک نہایت عمدہ اور پختہ سڑک بنی ہوئی ہے ہم جلدی وہاں پہنچ گئے۔ ہمارے آنے کی خبر سن کر بہت سے مزدور وہاں جمع ہو گئے۔

ان سب کے چہرے اداس تھے اور وہ خوفزدہ نظروں سے جنگل کی طرف بار بار دیکھ رہے تھے۔

قلی کی لاش مجھے دکھائی گئی۔ شیر نے اس کی ایک ٹانگ اور بایاں شانہ چبا لیا تھا۔ گردن اور سینے پر بھی گہرے گھاؤ تھے۔ اس قلی پر شیر نے اس وقت حملہ کیا جب وہ ایک درخت سے ربڑ نکال رہا تھا۔ اس کا پیالہ اور ٹوکا قریب ہی پڑے تھے انھیں بھی کسی نے ہدایت کے مطابق وہاں سے نہیں اٹھایا۔ شیر نے جب اسے نیچے گرا لیا تو وہ قلی کو گھسیٹ کر پندرہ گز دور جھاڑیوں میں لے گیا اور اپنا پیٹ بھرنے کے بعد لاش کو گھاس پھونس سے ڈھانپ کر چلا گیا۔ شیر کی یہ فطرت ہے کہ وہ اپنے شکار چھپا دیتا ہے تاکہ گدھ، بھیڑیئے، گیدڑ اور دوسرے جنگلی جانور آسانی سے اس کا سراغ نہ پا سکیں۔

ربڑ کے ان درختوں کی حفاظت کے لئے اونچی خاردار جھاڑیوں کی ایک دیوار چاروں طرف پھیلی ہوئی تھی۔ اس سے ذرا ہٹ کر انناس کے درختوں کا ایک جھنڈ تھا جس کا پھل فروخت نہیں کیا جاتا تھا، بلکہ مزدوروں کے لئے وقف تھا۔ اس جھنڈ کے ارد گرد بھی حفاظت کے لئے خاردار جھاڑیاں کھڑی کی گئیں تھیں تاکہ جنگلی سؤر ان درختوں کو نقصان نہ پہنچا سکیں۔ اس جھنڈ کے اندر جا بجا شیر کے پنجوں کے نشانات واضح طور پر دکھائی دے رہے تھے۔ اور وہ اس باڑ کے اندر سے گزر کر ربڑ کے جنگل تک پہنچا تھا، چنانچہ اس مقام پر باڑ کے اندر خاصا بڑا سوراخ بنا ہوا تھا جس سے پتہ چلتا تھا کہ جس شیر نے اسے عبور کیا ہے، وہ غیر معمولی قوت رکھتا ہے۔

وقت ضائع کئے بغیر میں نے اپنے اپنے آدمیوں کو حکم دیا کہ فوراً بیلچے اور کدالیں منگوائی جائیں۔ تھوڑی دیر بعد بیلچے اور کدالیں لئے ہوئے مزدور وہاں پہنچ گئے۔ اناناس کے درختوں کے جھنڈ میں عین اس مقام پر جہاں شیر نے جھاڑیوں کی باڑ کو عبور کیا تھا، چار فٹ لمبا، چار فٹ چوڑا، چار فٹ گہرا گڑھا کھودنے کی ہدایت کی۔ تین گھنٹے کی محنت کے بعد مزدوروں نے یہ گڑھا کھود ڈالا۔ گڑھے کا منہ ہم نے گھاس پھونس نرم شاخوں اور پتوں سے اس طرح ڈھانپ دیا کہ قریب سے دیکھنے پر بھی اندازہ نہ ہو سکے کہ یہاں گڑھا کھدا ہوا ہے۔ اس کے بعد گڑھے سے نکلی ہوئی مٹی جنگل میں اِدھر اُدھر ذرا فاصلے پر بکھیر دی گئی اور قلی کی لاش کو وہیں پڑا رہنے دیا گیا۔ جہاں ایک روز پہلے شیر نے اس کا کچھ حصہ کھایا تھا۔ مزدوروں کو سمجھا دیا گیا کہ اس حصّے میں کوئی شخص نہ آئے، ورنہ شیر خبردار ہو جائے گا اور ادھر کا رخ نہیں کرے گا۔ سپاہیوں کے ذمہ یہ ڈیوٹی لگائی گئی کہ وہ صبح کے وقت اس گڑھے کا معاینہ کریں۔ اگر شیر اس میں موجود ہو، تو مجھے جہور کے قلعے میں خبر کر دیں۔ مجھے امید تھی کہ شیر رات کو کسی وقت اِدھر آئے گا اور گڑھے میں ضرور گرے گا۔

لیکن اگلے روز دوپہر تک کوئی اطلاع نہ آئی، تو انتظار کی کوفت سے نجات پانے کے لئے میں علی کو ساتھ لے کر میں خود وہاں چلا گیا۔ صورت حال میں کوئی "تغیر" رونما نہیں ہوا تھا۔ شیر اس رات ادھر نہیں آیا اور کسی شخص نے اسے دیکھا اور نہ اس کی آواز سنی ۔ قلی کی لاش اب بدبو دینے لگی تھی اور اس کے ساتھی اور رشتے دار اس کی مزید "بے حرمتی" برداشت کرنے کے لئے تیار نہ تھے ۔ یہ لوگ اپنے عقیدے میں "کٹر" ہیں اور کوئی بات سننا پسند نہیں کرتے ۔ میں نے ان کی بدلی نگاہوں سے اندازہ کیا کہ وہ مجھ پر بھی شک کر رہے ہیں کہ میں لاش کو دفن کرنے کی اجازت کیوں نہیں دیتا، علی نے میرے کان میں کہا:۔

"صاحب، اب شیر کا انتظار بے سود ہے ۔ لاش میں سے بدبو اٹھ رہی ہے، بہتر ہے کہ اب اسے دبا دیا جائے۔"

میں نے اس کی رائے پر عمل کرتے ہوئے قلی کی لاش کو وہاں سے اٹھوا دیا۔ جسے بعد ازاں اس کے رشتے داروں نے لکڑی کے ایک صندوق میں بند کر کے اور اپنی مذہبی رسوم ادا کرنے کے بعد دفن کر دیا۔

اب سوال یہ تھا کہ میں کیا کروں؟ کیا سفر کا پروگرام ملتوی کر کے اس آدم خور کے تعاقب میں لگ جاؤں۔ یا سلطان جوہر سے صاف صاف کہہ دوں کہ میں یہاں رُک نہیں سکتا، کیونکہ جو جانور میرے قبضے میں ہیں، ان کی خوراک اور دیکھ بھال کا خرچ اتنا زیادہ ہے کہ میری جیب جلد ہی خالی ہو جائے گی۔ میں ان جانوروں کو وعدے کے مطابق امریکہ پہنچا دینا چاہتا ہوں ۔ ابھی میں اسی مخمصے میں مبتلا تھا کہ میجر نے مجھ سے کہا:

"میں اپنے آدمیوں کو لے کر جنگل میں آدم خور کو تلاش کرنے جا رہا ہوں ۔ میں اس کے ٹھکانے کا پتہ لگاؤں گا۔ اگر آپ چلنا چاہئیں تو چلیں۔"

میں نے اس سے کہا کہ وہ جنگل میں جا کر آدم خور کو تلاش کرے ۔ فی الحال میں سنگاپور واپس جا رہا ہوں۔ اس کے بعد میں سلطان جوہر سے بات کروں گا ۔ میرے دل کے کسی گوشے میں یہ خواہش سر اٹھا رہی تھی کہ اگر میں اس آدم خور کو پکڑنے میں کامیاب ہو جاؤں، تو وارے نیارے ہو سکتے ہیں۔ مجھے صرف اسی ایک شیر کی اتنی قیمت وصول ہو سکتی ہے ۔ جتنی قیمت ان جانوروں کو بیچ کر حاصل کروں گا ۔ لہذا کیوں نہ قسمت آزمائی کی جائے، لیکن اس لالچ کے ساتھ ہی یہ دہشت بھی میرے دل میں موجود تھی کہ یہ شیر آسانی سے قابو میں آنے والا نہیں، وہ آدمی کے لہو کا ذائقہ چکھ چکا ہے ۔ اگر اس نے مجھے اپنا نوالہ بنا لیا.......!

شام کے وقت میں نے اپنے ہوٹل سے جوہر کے قلعے میں فون کیا۔ معلوم ہوا کہ میجر اور اس کے سپاہیوں نے جنگل کا چپہ چپہ چھان مارا، مگر آدم خور کا کوئی سراغ نہیں مل سکا۔ میجر کا خیال ہے کہ درندہ اس علاقے سے نکل کر کسی سمت چلا گیا ہے اور جب تک وہ کوئی واردات نہ کرے۔ اس کا صحیح پتہ معلوم کرنا دشوار ہے ۔ یہ سن کر میں نے ایک سرد آہ بھری اور فون بند کر دیا۔ اس کا مطلب

تھا کہ قصہ ختم۔ میں نے اپنے دل سے اس شیر کا خیال نکال دیا اور اطمینان سے اپنے سفر کی ضروری تیاریوں میں مصروف ہو گیا۔

تیسرے روز علی الصبح سلطان جہور کی طرف سے بھیجا ہوا ایک "ضروری تار" میرے نام آیا۔ میں نے جب تار پر نظر ڈالی، تو حیرت سے اچھل پڑا۔ اس میں لکھا تھا:۔

"جلدی پہنچو، شیر گڑھے میں گر گیا ہے۔"

میں پھٹی پھٹی آنکھوں سے تار کا یہ مضمون دیکھتا رہا۔ خدا کی پناہ۔ میرے وہم و گمان میں بھی ایسا واقعہ اتنی جلد ممکن ہے۔ شاید کسی نے مذاق کیا ہے۔ میں دیوانہ وار سیڑھیاں پھلانگتا ہوا ہوٹل کے دفتر میں گیا اور جہور کے قلعے میں فون کیا۔ پندرہ منٹ انتظار کے بعد لائن مل گئی اور میں نے سلطان کی آواز سنی:۔

"بھئی، میں نے تم سے فون پر بات کرنے کی کوشش کی تھی، مگر معلوم ہوا کہ ہوٹل کا فون خراب ہے مجبوراً تار بھیجنا پڑا۔ تم فوراً پہنچو۔"

میں نے اپنے ملازم علی سے کہا کہ وہ موٹر کا انتظام کرے۔ جلد جلد میں نے ضرورت کی چند چیزیں اپنے تھیلے میں رکھیں اور موٹر میں بیٹھ کر ستّر میل فی گھنٹے کی رفتار سے جہور کے جنگل کی جانب روانہ ہو گیا۔ میرے جوش و اضطراب کی انتہا نہ تھی۔ اب مجھے صرف یہ فکر تھی کہ وہ بے وقوف مزدور کوئی ایسی حرکت نہ کریں جس سے گڑھے میں گرا ہوا شیر فرار ہونے میں کامیاب ہو جاتے ہیں جب وہاں پہنچا تو ایک ہنگامہ برپا تھا۔ ہر شخص بدحواسی کے عالم میں ادھر سے اُدھر بھاگا پھر رہا تھا۔ اتنا شور تھا کہ کان پڑی آواز نہ سنائی دیتی تھی سینکڑوں مزدور اور قلی جنگل میں اور اناس کے درختوں کے جھنڈ میں کھڑے تھے اور سب کی نظریں اس گڑھے میں لگی ہوئی تھیں، جس کے اوپر کٹے ہوئے درختوں کے بڑے بڑے تنے رکھ دیئے گئے تھے۔ یہ دیکھ کر میں نے اطمینان کا سانس لیا۔ گڑھے میں سے جب شیر کے غرّانے کی آواز میرے کان میں پہنچی، تو پہلی بار فتح مندانہ مسکراہٹ میرے ہونٹوں پر نمودار ہوئی۔ میں نے علی سے کہا:

"دیکھا، آخر ہم نے شیر کو پکڑ ہی لیا۔"

وہ قہقہہ مار کر ہنسا اور بولا:۔

جناب مجھے پہلے ہی پتہ تھا کہ شیر ضرور اس میں گرے گا۔"

"ہاں، ہاں ۔۔ تمہیں تو پہلے ہی سے ہر بات کا پتہ ہوتا ہے۔"

منیجر اور اس کے سپاہی بھی وہاں موجود تھے۔ ان کے علاوہ ایک انگریز عورت اور اس کا شوہر بڑی دلچسپی سے یہ تماشا دیکھ رہے تھے۔ عورت کے ہاتھ میں کیمرا تھا اور وہ مختلف زاویوں سے

تصویریں اتار رہی تھی۔ مجھے دیکھتے ہی مزدوروں کے چہرے کھل اُٹھے اور وہ بھاگ بھاگ کر میرے گرد جمع ہونے لگے۔

اب ہر شخص اس کوشش میں تھا کہ شیر پکڑے جانے کی داستان سب سے پہلے وہ سُنائے۔ میں نے بمشکل ان کو پرے دھکیلا اور کہا:

"مجھے پہلے شیر کو دیکھنے دو، اس کے بعد میں ہر شخص کا قصہ سُننے کے لئے تیار ہوں۔"

میجر اور اس کے سپاہیوں نے گڑھے پر رکھے ہوئے بڑے بڑے تنوں میں سے ایک تنا اُٹھایا، میں نے جھک کر گھاس پھونس اور پتوں میں سے جھانکا، تو ایک بہت بڑا شیر منہ کھولے اپنی سرخ سرخ آنکھوں سے مجھے گھور رہا تھا۔ آنِ واحد میں وہ غرّا کر اچھلا اور پنجہ مارنے کی کوشش کی۔ اُس کا پنجہ میرے چہرے سے ایک فٹ دُور آ رہ گیا۔ میں نے اندازہ کیا کہ اگر درخت کے تنے گڑھے کے منہ پر نہ رکھے جاتے تو یہ قوی الجثہ شیر اس گڑھے میں سے بڑی آسانی سے نکل سکتا تھا۔ اس کے لئے صرف ایک چھلانگ ہی کافی تھی۔ میں نے اپنی زندگی میں بڑے بڑے جسیم اور قوی شیر دیکھے تھے، لیکن ملایا کا یہ آدم خور اپنی مثال آپ تھا۔ اس کا قد بلا مبالغہ گدھے سے بھی اونچا اور لمبائی بارہ فٹ تھی، بلکہ اس سے بھی زائد ہوگی۔ اب میرے سامنے یہ مسئلہ تھا کہ اتنے قوی شیر کو اس گڑھے میں سے کیسے نکالا جائے۔ اس دوران میں اگر یہ آزاد ہوگیا، تو پھر کیا ہوگا؟ پہلے میرا خیال تھا کہ کوئی چھوٹا موٹا شیر ہوگا۔ اسے میں رسیّوں کے پھندے کے ذریعے جکڑ کر باہر نکال لوں گا۔ ایک بات میں آپ کو بتانا بھول گیا کہ گڑھا اوپر سے چار فٹ لمبا اور چار فٹ چوڑا تھا، لیکن زیادہ گہرائی میں جا کر اس کی وسعت بھی دس فٹ تک پھیل گئی تھی تاکہ اتنی جگہ میں پنجرہ بھی اتارا جا سکے۔ شیر کو دیکھ کر میں سخت بدحواس تھا کہ اُسے آخر کس طرح پنجرے میں بند کیا جا سکے گا۔ میرا طریقہ ہمیشہ سے یہ رہا ہے کہ شیر جب گڑھے میں گر جاتا، تو میں رسیوں کی مدد سے لوہے کا پنجرہ گڑھے میں لٹکا دیتا۔ اس پنجرے میں کسی جانور کو بند کر دیا جاتا۔ پنجرے کا دروازہ رسّی کے ذریعے مرضی کے مطابق کھولا اور بند کیا جا سکتا تھا۔ شیر کو ایک دن بھوکا رکھا جاتا، شیر پنجرے کے جانور کو کھانے کے لئے جب بالکل آمادہ ہو جاتا، تو پھر پنجرے کا دروازہ اوپر اُٹھا لیا جاتا۔ شیر پنجرے میں گھس کر اس جانور پر جھپٹتا اور فوراً ہی پنجرے کا دروازہ اوپر سے گرا دیا جاتا۔ اس طرح شیر پنجرے میں قید ہو جاتا اور ہم اُسے آسانی سے باہر نکال لیتے۔ لیکن اس شیر کے معاملے میں صورت حال ہی دوسری تھی۔ میں نے جو گڑھا قاعدے کے مطابق کھدوایا تھا وہ اس شیر کے لئے ناکافی تھا۔ فرض کیجئے میں پنجرہ نیچے لٹکاتا ہوں، جانتے ہو شیر کیا کرے گا؟ وہ فوراً پنجرے پر چڑھے گا اور دوسرے ہی لمحے چھلانگ مار کر گڑھے سے باہر آ جائے گا۔ مجھے دراصل پندرہ بیس فٹ کے بجائے یہ گڑھا تیس فٹ کی گہرائی تک کھدوانا چاہیئے تھا، مگر اب کیا ہو سکتا تھا؟

میں نے گھڑی پر نگاہ ڈالی، سورج غروب ہونے میں ابھی کئی گھنٹے باقی تھے۔ میں نے فیصلہ کیا کہ

خواہ کچھ ہو، مجھے آج ہی اس آدم خور کو پنجرے میں قید کر کے سنگاپور لے جانا ہے۔ میں نے لوگوں کو ہدایت کی کہ میں سنگاپور جا رہا ہوں، ضروری انتظامات کے لئے پھر واپس آؤں گا۔ اس دوران میں وہ آدم خور کی پوری پوری حفاظت کریں۔ ایک بار پھر میں نے اپنی موٹر کو ساٹھ میل فی گھنٹہ کی رفتار سے چھوڑ دیا۔ علی میرے ساتھ تھا۔ ہن مونگ اور اس کے شاگرد اپنے مکان پہ موجود تھے۔ میں نے ان سے کہا کہ وہ فوراً سب کام چھوڑ کر ایک بڑا پنجرہ ایک گھنٹے کے اندر اندر تیار کر دیں۔ میں نے شیر کی جسامت کو پیش نظر رکھتے ہوئے پنجرے کا نقشہ بھی انھیں سمجھا دیا۔ پھر بازار سے تین سو فٹ لمبا اور ڈھائی انچ چوڑا بے حد مضبوط رسا خریدا۔ رسا خریدنے کے بعد میں بندرگاہ پر گیا اور وزن اتارنے کی مشین عاریتاً حاصل کی۔ اس کے بعد شہر واپس آ کر ایک ٹرک کرایہ پر لیا۔ اس اثنا میں ہن مونگ اور اس کے شاگرد پنجرہ تیار کر چکے تھے۔ پنجرہ رسّا اور جرِ ثقیل میں نے ٹرک میں رکھ لئے۔ علی کے بھتیجے سے کہا کہ وہ فوراً جہور کی طرف چل پڑے میں علی کو لے کر اپنی کار میں پیچھے پیچھے آتا ہوں۔ میرا ارادہ تھا کہ راستے میں قلعہ جہور میں رک کر سلطان سے ملتا چلوں۔ جونہی میری گاڑی قلعے کے وسیع صحن میں رکی، سلطان اپنے کمرے سے برآمد ہوا۔ اس کا چہرہ خوشی سے دمک رہا تھا۔ اس نے گرمجوشی سے مصافحہ کیا اور مبارک باد دی۔ پھر کہنے لگا:

"اچھا ہوا کہ تم یہاں آ کر مجھ سے مل لئے، ورنہ شیر تم کو کھا جاتا، تو میں کبھی تمہیں معاف نہ کرتا۔"

میں ہنس پڑا۔ سلطان کی نظر کار میں رکھی ہوئی چمڑے کی کمند پر پڑی۔ اس نے حیرت سے پوچھا۔

"کیا تم کمند کا استعمال جانتے ہو؟ لیکن میں نے سنا ہے کہ امریکہ میں کاؤ بوائے کمندوں کے ذریعہ گھوڑوں اور سانڈوں کو قابو میں لایا کرتے ہیں۔ اب تم یہ طریقہ شیر پر آزمانا چاہتے ہو۔ میرے خیال میں ایسا کرنا خطرناک ہوگا۔"

"ہز ہائی نس، آپ فکر نہ کریں، میں اس کمند کو پہلے بھی کئی بار شیروں پر استعمال کر چکا ہوں اور کبھی ناکام نہیں ہوا۔ ایک دن آپ دیکھیں گے کہ میں اسی کے ذریعے ہاتھی کو گرفتار کر لوں گا۔"

سلطان نے قہقہہ لگایا۔ "ارے تم اس شیر کو تو پہلے پکڑو، ہاتھی تو بعد میں آئے گا۔ میاں یہ امریکی گائے نہیں، ملایا کا شیر ہے شیر — کیا سمجھے؟"

یہ سن کر میری رگِ حمیت پھڑک اٹھی اور میں نے کہا:

"ہز ہائی نس، اگر آج سورج غروب ہونے سے پہلے پہلے شیر کو آپ کے قدموں پہ ڈال دوں، تو آپ کیا انعام دیں گے؟"

"ناممکن — قطعی ناممکن —" سلطان نے اور قہقہہ لگایا۔ "مجھے تو خدشہ ہے کہ وہ تمہیں ہڑپ نہ کر جائے۔" علی، اپنے "صاحب" کا ذرا خیال رکھنا۔ بہرحال اگر تم کامیاب ہوئے تو شامپین کی ایک بوتل تمہارے لئے تیار ہوگی۔ اب جاؤ خدا حافظ۔"

جب میں قلعے سے موٹر لے کر نکلا، تو آسمان پر سیاہ بادل جمع ہو رہے تھے اور کہیں کہیں بجلی بھی کڑک رہی تھی۔ علی نے کہا:

"بارش ہونے والی ہے، ذرا جلدی پہنچنا ہے۔"

میں نے ایکسیلٹر پر پیر رکھ دیا اور موٹر ہوا سے باتیں کرنے لگی۔ میں سوچ رہا تھا کہ اگر بارش شروع ہو گئی تو کام بگڑ جائے گا۔ سب سے پہلی مشکل تو یہ ہو گی کہ جنگل کی نرم زمین بارش میں بھیگ کر پھسلواں ہو جائے گی اور دوسری رکاوٹ رسّا پیدا کرے گا۔ آپ جانتے ہیں کہ پانی میں تر ہو کر رسّا کتنا سخت ہو جاتا ہے۔ میں اگر شیر کو سورج چھپنے سے پہلے پہلے سلطان کے پاس نہ لے جا سکا، تو بڑی سبکی ہو گی۔ شاید قدرت مجھے اس بے جا دعوے کی سزا دینے کے لئے بارش کا یہ زبردست طوفان نازل کر رہی ہے۔

اس روز میں نے ستر میل فی گھنٹہ کی رفتار سے موٹر چلائی۔ علی میرے ساتھ بیٹھا تھر تھر کانپ رہا تھا۔ اس نے دبی زبان سے موٹر آہستہ چلانے کے لئے کہا بھی تھا مگر میں بارش سے پہلے وہاں پہنچنا چاہتا تھا۔ لیکن جونہی میں سڑک کی آخری حد تک پہنچ کر موٹر سے اُترا۔ بارش شروع ہو گئی۔ اب ہمیں تین میل کا سفر پیدل طے کرنا تھا۔ کیونکہ اندر آگے گھنا جنگل تھا اور موٹر اس کے اندر نہیں جا سکتی تھی۔ ہمارے کپڑے جلد ہی پانی سے تر ہو گئے، مگر ہم رُکے نہیں، بلکہ ہم مسلسل دوڑتے رہے۔ گڑھے کے ارد گرد بہت سے قلی گھیرا ڈالے کھڑے تھے۔ میجر اور اس کے سپاہی بھی بارش میں بھیگ رہے تھے۔ مجھے ان کی فرض شناسی پر دلی خوشی ہوئی۔ میں نے میجر کا شکریہ ادا کیا۔ تو وہ صرف مسکرا دیا۔

بارش کی پروا کئے بغیر میں تندہی سے اپنے کام میں مصروف ہو گیا۔ گڑھے کے اندر شیر پانی میں بھیگنے کے باعث غرّا رہا تھا اور مزدور خوف زدہ ہو کر پیچھے ہٹنے لگے تھے۔ میں نے اُنھیں سمجھایا کہ شیر اس گڑھے میں سے نکل نہیں سکتا، اس لئے وہ اطمینان سے وہیں کھڑے رہیں۔ میں چند منٹ میں اُسے پنجرے کے اندر بند کر دوں گا۔ وہ سب مجھے حیرت سے دیکھ رہے تھے۔ میں نے اپنا لمبا شکاری چاقو نکالا اور رسے کے کئی ٹکڑے کر دیئے۔ پھر ان کے سروں پر مختلف پھندے بنائے۔ اس کے بعد میں نے مزدوروں کی مدد سے گڑھے کے اوپر رکھے ہوئے تنوں میں سے درمیانی تنا اُٹھایا۔ اب میں شیر کو گڑھے کے اندر اچھی طرح دیکھ سکتا تھا۔ بارش کا پانی گڑھے میں جمع ہونے کے باعث شیر کا جسم کیچڑ میں اچھی طرح لت پت ہو چکا تھا اور وہ منہ کھولے بری طرح دھاڑ رہا تھا۔ غالباً وہ بھوکا بھی تھا۔

چند منٹ تک شیر کی حرکات بغور دیکھنے کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچا کہ اس کے پنجے چکنی مٹی کے اندر پھسل رہے ہیں، کیونکہ جب وہ بے قراری سے اِدھر اُدھر گھومتا یا گڑھے کی دیوار پر پنجے رکھ کر اوپر اچھلنے کی کوشش کرتا، تو اس کے پنجے پھسل جاتے اور وہ پیٹھ کے بل گڑھے میں جا گرتا۔ میں خوش تھا

کہ بارش نے میرے کام میں جوڑ کاوٹ ڈالی ہے، شیر بھی اس سے محفوظ نہیں رہا۔

میں نے میجر اور اس کے سپاہیوں سے کہا کہ وہ ہوشیار رہیں اور اپنی بندوقیں ہنگامی حالت کے لئے تیار رکھیں، کیونکہ ہمارا واسطہ ایک آدم خور درندے سے تھا جو نہ جانے کب ہمارے ہاتھوں سے نکل جائے اور کس کی جان لے لے۔ اُدھر بارش لحہ بہ لحہ تیز ہوتی جارہی تھی۔ آسمان پر سیاہ بادلوں کی فوج اُمڈ اُمڈ کر آرہی تھی اور بجلی اس زور سے کڑکتی کہ دل دہل جاتے۔ ہوا کی شدّت سے پانی کے تھپیڑے اس زور سے چہرے پر پڑتے کہ کچھ سجھائی نہ دیتا۔ پھر آدم خور کا مسلسل چیخنا اور دھاڑنا۔ آپ اندازہ کرسکتے ہیں کہ کیا قیامت خیز سماں ہوگا۔

میں گڑھے کے کنارے پر گھٹنوں کے بل بیٹھ گیا اور کمند شیر کی گردن میں پھنسانے کی کوشش کرنے لگا۔ کئی مرتبہ پھندا اس کے گلے میں پڑا، مگر جونہی میں اسے کھینچنا چاہتا، شیر زور سے جھٹکا مارتا اور اپنی گردن پھندے میں سے نکال لیتا اور پھر غیظ و غضب سے دھاڑنے اور اُچھلنے لگتا۔ اُسے فوراً یہ احساس ہوگیا تھا کہ میں اس کی گردن رسّے سے جکڑ لینا چاہتا ہوں۔ ایک بار جب میں نے بڑی احتیاط سے پھندا اس کی گردن پر پھینکا، تو شیر نے اپنا منہ کھول کر اُسے دانتوں میں دبالیا اور اس زور کا جھٹکا مارا کہ اگر گڑھے کے اوپر رکھے ہوئے تنوں کا سہارا مجھے نہ ملتا، تو میں لازماً اس میں جاگرتا اور شیر کی خوراک بن جاتا۔ ظالم کے دانت ریزر بلیڈ کی مانند تیز تھے۔ اس نے کئی رسّوں کو دانتوں سے کاٹ کر بیکار کردیا۔

ایک گھنٹے کی زبردست اور جان لیوا کوشش نے مجھے اور شیر دونوں کو تھکادیا۔ اب میں نے ایک نیا پھندا بنا کر ڈالا شیر نے اُسے بھی منہ میں دبانا چاہا، مگر کامیاب نہ ہوا۔ میں نے فوراً رسّا کھینچ لیا اور شیر کا جبڑا پھندے میں آکر کھلا کا کھلا رہ گیا۔ اب وہ اپنا منہ بند نہیں کرسکتا تھا۔ میں نے جلدی سے رسے کا سرا دو مزدوروں کو تھمایا اور انھیں ہدایت کی کہ اسے ڈھیلا نہ ہونے دیں۔ اس کے بعد دوسرا پھندا پھینکا۔ اسے شیر کے دائیں پنجے میں پھنسا کر یہ بھی میں نے دو مزدوروں کے حوالے کیا۔ پھر اس کا بایاں پنجہ اور کمر رسّوں میں جکڑ لی۔ اب بیک وقت پندرہ مزدور اس قوی ہیکل شیر کو رسوں میں پھنسائے ہوئے کھڑے تھے۔

شیر گڑھے کے اندر پوری دقت سے اچھل رہا تھا۔ میں نے اُسے اب آٹھ پھندوں میں گرفتار کرلیا۔ گڑھے کے چاروں طرف مزدور اور قلی رسّے تھامے ہوئے تھے اور اکیلا شیر قوت میں ان سب پر بھاری تھا۔ میں بار بار انھیں ہدایت کرتا کہ اگر رسّے ذرا بھی ڈھیلے ہوئے، تو شیر آزاد ہوجائے گا۔ شیر سے اس زور آزمائی اور بارش میں مسلسل بھیگنے کا نتیجہ یہ نکلا کہ میرے کندھے، گردن اور پیٹھ شل ہوگئی۔ اُدھر پانی آنکھوں میں بار بار آجاتا۔ جب میں نے دیکھا کہ شیر اچھی طرح قابو میں آگیا ہے، تو قلیوں

کو حکم دیا گیا کہ وہ آہستہ آہستہ رسوں کو اپنی طرف کھینچیں ——— اور ہم شیر کو گڑھے کی گہرائی سے نکال کر سطح کے قریب لے آئیں۔ شیر کو اوپر اٹھانے کے لئے مزدوروں کو اس قدر زور لگانا پڑا کہ بیچارے ہانپنے کانپنے لگے، تاہم انھوں نے ہمت نہ ہاری۔

ابھی میں سپاہیوں کو پنجرہ گڑھے میں لٹکانے کا حکم دینے ہی والا تھا کہ ایک قلی کی چیخ سنائی دی۔ میں نے مڑ کر دیکھا، تو وہ قلی جس نے سب سے پہلا رسا تھام رکھا تھا، پھسلتا ہوا گڑھے کے کنارے تک آگیا تھا، اس کے قدم اکھڑ چکے تھے۔ میں اب اس پوزیشن میں کھڑا تھا کہ ہاتھ بڑھا کر اسے تھام لوں اور جونہی میں نے لپک کر اسے پکڑنا چاہا، خود میرے پیر بھی پھسل گئے اور میں قلی کے ساتھ گھسٹتا ہوا گڑھے میں گرنے ہی والا تھا کہ میرے عقب میں کھڑے ہوئے علی نے جست لگا کر وہ رسا پکڑ لیا جو میرے ہاتھ سے چھوٹنے والا تھا۔ پھر سپاہیوں نے فوراً ہمیں آن کر تھام لیا، ورنہ میں اور دو قلی ضرور گڑھے میں گر جاتے اور ہمارا کیا حشر ہوتا، اسے سوچ کر میں آج بھی کانپ جاتا ہوں۔ نتیجہ یہ نکلتا کہ میرے اور قلی کے گرتے ہی دوسرے قلی بدحواس ہو کر رسّے ہاتھوں سے چھوڑ دیتے اور آدم خور آزاد ہو کر ہمارے ساتھ ہی گڑھے میں گرتا۔

قلیوں کے حلق سے اس اچانک خطرے پر چیخیں نکل رہی تھیں۔ بارش نے زمین اس قدر چکنی اور پھسلواں کر دی تھی کہ ان کے قدم جمنے دشوار ہو رہے تھے۔ اُدھر شیر ان کو مسلسل جھٹکے دے رہا تھا۔ سپاہیوں نے جلدی سے پنجرہ گڑھے میں اتارا۔ شیر کا سر گڑھے کی سطح کو چھو رہا تھا اور اس کی دُم نیچے لٹک رہی تھی۔ میں نے پنجرہ اس رخ سے گڑھے میں رکھوایا کہ اس کا دروازہ اوپر کی جانب کھلتا تھا۔ اب شیر کو اس دروازے سے اندر داخل کرنا تھا، اس کے بعد وہ بالکل ہمارے قابو میں آجاتا، لیکن یہی سب سے زیادہ خطرناک کام تھا

میں دیکھ رہا تھا کہ اگر تھوڑی دیر تک ان مزدوروں کو رسّے سے نجات نہ دلائی گئی، تو رسّا ان کے ہاتھوں سے نکل جائے گا اور اس طرح ساری محنت پر آن واحد میں پانی پھر سکتا ہے۔ میں نے جلد جلد علی کو اپنے منصوبے سے آگاہ کیا۔ پھر میں نے میجر سے کہا:

"میجر، اب یہ معاملہ تمہارے اوپر چھوڑتا ہوں۔ ان قلیوں کو سنبھالے رہنا۔"

اس سے پیشتر کہ وہ کچھ پوچھے یا کہے، میں نے ایک اور رسّا پکڑا اور اس کے سہارے گڑھے میں اُتر گیا۔ اب شیر میرے سر پہ لٹک رہا تھا اور میں پنجرے کے قریب کھڑا اُسے دیکھ رہا تھا۔ میں نے ایک بار پھر گڑھے میں سے چلا کر کہا:

"میجر، رسّوں کو مضبوطی سے تھامے رکھنا، ورنہ شیر مجھے زندہ نہ چھوڑے گا ——— بس چند منٹ کی تکلیف اور ہے اور ہاں اپنی بندوقیں بھی سنبھالے رکھو۔"

اب میں خود مٹی اور کیچڑ میں اچھی طرح لت پت ہو چکا تھا۔ پنجرے کا دروازہ کھولنے کے بعد میں نے شیر کی دُم پکڑ لی اور اُسے گھسیٹ کر پنجرے کے عین اوپر لے آیا اور پھر پکار کر کہا:

" اب سب لوگ نہایت احتیاط سے آہستہ آہستہ آگے بڑھتے جائیں۔ دیکھنا کسی کا پیر پھسلنے پائے ــــــ "

شیر کا آدھا دھڑ جب پنجرے میں داخل ہوا، تو میں نے کہا:

" رسّے چھوڑ دو "

قلیوں نے اک دم رسّے چھوڑ دیئے اور ایک دھماکے کے ساتھ جھور کا آدم خور پنجرے میں گر گیا۔ میں نے پھرتی سے سلاخ دار دروازہ گرا دیا۔ شیر بُری طرح دھاڑ رہا تھا۔ پنجرے میں بند ہوتے ہی اُس نے اس کی دیواروں کو ہلانا شروع کر دیا اور اس سے پیشتر کہ میں گڑھے سے باہر نکلوں، لکڑی کے بنے ہوئے بے حد مضبوط پنجرے کی ایک دیوار چرچرانے لگی اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ایک تختہ باہر نکل آیا۔ یہ دیکھ کر میرے ہوش اُڑ گئے۔ شیر اگر اُسے ایک دھکّا اور لگاتا، تو تختہ یقیناً اُکھڑ جاتا۔ یقین کیجیے دہشت سے میرا بدن سُن ہو گیا، شیر کا وزن کم از کم تین سو پونڈ تھا اور ظاہر ہے کہ اتنے وزنی درندے کے لئے لکڑی کا پنجرہ توڑ دینا آسان بات تھی۔ ایک بار پھر میں حلق پھاڑ کر چیخا:۔

" جلدی سے ہتھوڑا اور کیلیں مجھے دے دو۔ جلدی ...... خدا تمہیں غارت کرے۔ ہتھوڑا اور کیلیں مجھے پکڑا دو "

اتنے میں تختہ ذرا سا اور باہر نکلا۔ میں نے اُسے پیچھے دھکیلنے کے لئے اپنی پوری جسمانی قوت صرف کر دی۔ کئی منٹ گزر گئے، ہتھوڑا اور کیلیں مجھے نہ ملیں، البتہ گڑھے کے اوپر مزدوروں کے چلّانے اور بھاگنے دوڑنے کی آوازیں سُنائی دے رہی تھیں۔ مجھ پر ایک ایک لمحہ عذاب کی مانند گزر رہا تھا۔ میں پھر پاگلوں کی طرح چیخا:۔

" ارے ظالمو، ہتھوڑا اور کیلیں مجھے دے دو، علی، تم بھی میری آواز نہیں سُنتے ؟ "

تب علی نے گڑھے کے اوپر سے جھانک کر دیکھا اور کہا:

" صاحب، ہتھوڑا اور کیلیں مل ہی نہیں رہیں ــــ سب لوگ تلاش کر رہے ہیں۔ شاید وہ مٹی کے ڈھیر میں گم ہو گئی ہیں "

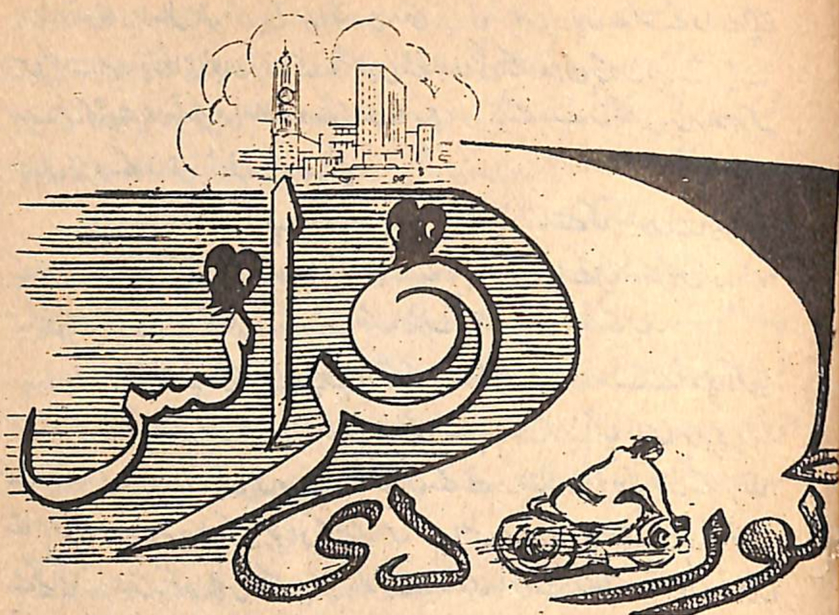
میں نے اپنا سر پیٹ لیا: " میں تم سب کو قتل کر دوں گا، کسی کو زندہ نہ چھوڑوں گا، ورنہ مجھے ہتھوڑا اور کیلیں مہیّا کر دو۔ اُلّو، گدھو، ...... " مجھے یاد نہیں کہ میں نے قلیوں اور مزدوروں کے علاوہ میجر اور اس کے سپاہیوں کو بھی کتنی گالیاں دے ڈالی تھیں۔ آخر آواز آئی:

" ہتھوڑا مل گیا ہے مگر کیلیں نہیں ملتیں "

مجھے اس وقت ایسا غصہ آیا کہ اگر ان میں سے کوئی میرے نزدیک ہوتا، تو میں ضرور گلا گھونٹ دیتا۔ پھر کسی نے اوپر سے ہتھوڑا نیچے پھینکا۔ اُدھر شیر پنجرے کا ایک کمزور مقام تلاش کر کے وہاں قوت آزمائی کر رہا تھا۔ میں نے گڑھے کی دیوار میں اپنے دونوں پیر ٹکا کر ہاتھوں کی قوت سے تختے کے کنارے پر ابھری ہوئی کیلیں ٹھونکیں۔ کم بخت من موگ نے جلدی میں پنجرے کے اس جانب کیلیں بہت کم لگائی تھیں اور یہی وجہ تھی کہ تختہ اُکھڑ رہا تھا۔ خدا خدا کر کے علی نے کیچڑ میں سے کیلیں تلاش کر کے مجھ تک پہنچائیں اور جب میں نے سب کیلیں اچھی طرح ٹھونک دیں، تو میں بے دم ہو کر وہیں گڑھے میں لیٹ گیا۔

جب ہم نے آدم خور کے پنجرے کو گڑھے سے نکال کر ٹرک میں رکھا، تو بارش کے طوفان کی تندی میں فرق آچکا تھا۔ بادل آہستہ آہستہ پھٹنے لگے اور جب ہم بھور کے قلعے تک پہنچے، تو سلطان میرے استقبال کے لیے دروازے پر کھڑا تھا۔ عین اس وقت مغرب میں بادلوں کے اندر سے ڈوبتے ہوئے سورج نے ایک لمحے کے لیے جھانکا اور پھر روپوش ہوگیا۔ سلطان کا چہرا فرطِ مسرّت سے تمتما رہا تھا۔ اس نے آگے بڑھ کر مجھے سینے سے لپٹا لیا اور جب وہ معانقے کے بعد الگ ہوا۔ تو میرے جسم پر تھپی ہوئی کیچڑ کا بڑا حصہ اس کے قیمتی کپڑوں کو داغدار کر چکا تھا۔ 

⁘ ⁘ ⁘



دنیا میں سائیکل تیز چلانے کے جتنے مقابلے ہو رہے ہیں ان میں "ٹور دی فرانس" نامی مقابلے سے اب تک کوئی بازی نہیں لے جا سکا ہے۔ یہ مقابلہ جو فرانس میں ہر سال تقریباً بائیس روز تک جاری رہتا ہے، اپنی عجیب نوعیت، عظیم الشان اہتمام اور کثیر اخراجات کی وجہ سے ایک منفرد، خصوصیت کا حامل بن گیا ہے۔ مہینوں پہلے سے اس کا انتظار کیا جاتا ہے اور جب مقابلہ شروع ہو جاتا ہے، تو اہل ملک کی تمام تر توجہ صرف اسی مقابلے پر مرتکز ہو جاتی ہے۔ اس غیر معمولی شغف کی بابت ایک بڑا دلچسپ لطیفہ ہے۔

آج سے کچھ عرصہ پیشتر فرانس کی مجلسِ قانون ساز کی ایک نشست میں حزبِ مخالف کی طرف سے ایسی پرجوش تقریریں ہوئیں کہ کابینہ کا ایک وزیر غصے میں بھر کر اُٹھ کھڑا ہوا اور بولا:

"آپ صاحبان نے اس دفعہ ایسا خطرناک رویہ اختیار کیا ہے جس سے حکومت کے خلاف عوام کی بغاوت کا اندیشہ ہونے لگا ہے۔" مگر دوسرے وزیر نے، جو اس کے قریب ہی بیٹھا تھا، یہ کہتے ہوئے اُسے بٹھا لیا:۔

"عالی مرتبت، آپ ذرا پریشان نہ ہوں، کسی بغاوت کا اندیشہ نہیں ہے۔ "ٹور دی فرانس" شروع ہونے والا ہے۔ فرانس کے کسی فرد کو بغاوت میں حصّہ لینے کی فرصت نہیں ہوگی۔"

یہ مقابلہ ابتداء سے انتہا تک نہایت شاندار، نہایت دلکش، ہمت آزما اور حادثات سے لبریز ہوتا ہے۔ ہر سال مقررہ تاریخ اور وقت پر انتخاب کی شرطوں پر پورے اُترنے والے ایک سو بیس صحت مند اور توانا نوجوان اپنی اپنی سائیکلیں لئے، روانگی کے اعلان پر کان لگائے ایک صف میں کھڑے ہوتے ہیں۔ اعلان ہوتے ہی آنِ واحد میں سب کے سب سائیکلوں پر سوار ہو کر انتہائی تیزی کے ساتھ دوڑ شروع کر دیتے ہیں۔

اس مقابلے میں سارا یورپ خاص طور پر دلچسپی لیتا ہے۔ راستے کی بستیوں میں جب پارٹی کے گزرنے کی اطلاع پہنچتی ہے، تو کاروبار رُک جاتا ہے۔ بازار بند ہو جاتے ہیں، اسکولوں اور دفتروں میں چھٹی ہو جاتی ہے اور تماشائیوں کے ٹھٹ کے ٹھٹ سڑک کے کنارے جمع ہو جاتے ہیں۔

۱۹۵۷ء میں چونسٹھ سائیکل سوار واپس نہیں آئے ۱۹۵۸ء میں ۴۴ کے علاوہ سب نے ٹور پورا کر لیا جس کے معنی یہ تھے کہ مقابلہ بہت آسان رہا، لہٰذا ۱۹۵۹ء میں اسے کچھ سخت کر دیا گیا۔ اس مرتبہ چوبیس روز تک دوڑ جاری رہی۔ درمیان میں صرف دو دن چھٹی کے تھے۔ مقابلہ ۲۵ رجون کو جرمنی کے سرحدی مقام مل ہاوس سے شروع ہو کر ۱۸ رجولائی کو پیرس میں ختم ہوا جس میں دو ہزار چھ سو چوراسی میل کا فاصلہ طے کیا گیا۔ راستے میں کوہ ایلپس اور کوہ پر ینیز کے بیس درّے بھی حائل تھے۔ مقابلہ کرنے والوں نے بائیس شہروں میں ایک ایک رات قیام کیا۔ بیس ہزار ڈالر انعام میں تقسیم ہوئے۔

مقابلہ کرنے والی پارٹی کے پیچھے عموماً ایک ہزار آدمی، تین سو پچاس کاریں، ٹرک اور ایمبولینس گاڑیاں، ایک سو موٹر سائیکلیں اور بہت سی دوسری قسم کی گاڑیاں ہوتی ہیں۔ اخباری نمائندوں، ڈاکٹروں مالش کرنے اور ہاتھ پاؤں دبانے والوں کی ایک فوج ساتھ چلتی ہے اور یہ سارا کارواں تمام سڑک کی تیس میل لمبائی کو گھیرے ہوئے چلتا ہے۔ اندازہ کیا گیا ہے کہ ڈیڑھ کروڑ سے زیادہ تماشائی پرشوق نگاہوں سے اس رواں دواں سیلاب کا نظارہ کرتے ہیں جنہیں قابو میں رکھنے کے لئے پولیس کے ستر ہزار سپاہیوں کی ضرورت ہوتی ہے۔

یہ قافلہ جن سلطنتوں کی حدود سے ہو کر گزرتا ہے، وہاں داخلے کے وقت اس سے رسمی قوانین کی پابندی نہیں کرائی جاتی۔ سرحد کے نگراں اور چنگی کا عملہ مطلق تعرّض نہیں کرتا۔ باڑ اُٹھا دی جاتی ہے اور قافلہ آزادی سے گزرتا چلا جاتا ہے۔ اس موقعے سے کچھ سمگلر بھی فائدہ اُٹھا لیتے ہیں۔

"ٹور دی فرانس"، کی بنیاد ۱۹۰۳ء میں پڑی تھی۔ اس کھیل کود کی بنا رڈالنے والا ایک اخبار کا ایڈیٹر تھا اور اس کا مقصد اخبار کو شہرت دینا اور اشاعت بڑھانا تھا۔ پہلی مرتبہ دودکش صاف کرنے والے ایک مزدور مسٹر گرین نے اول انعام حاصل کیا جس نے پندرہ سو میل کا فاصلہ چورانوے گھنٹے پینتیس منٹ میں طے کیا تھا۔ شروع شروع میں صرف فرانس کے سائیکل سواروں نے حصہ لیا تھا۔

آگے چل کر یورپ کے دوسرے ملک بھی شریک ہونے لگے۔

فرانس نے والہانہ شوق کے ساتھ ٹور کا خیر مقدم کیا، لیکن دوسرے ہی سال سے اسکا جذبۂ شوق وطنی و قومی عصبیت، مذہبی تعصب اور ذاتیات کا شکار ہونے لگا۔ اس سال گرین مقابلے میں دوبارہ شریک ہو کر فرانس کے جس حصّے سے گزرا، وہاں کے لوگوں نے اسے نام و نمود میں اپنے کسی مقامی سائیکل سوار سے بڑھتے دیکھ کر اس کی راہ میں کیلیں بچھا دیں۔ ایک بار موٹے دستانے پہنے ہوئے سو آدمیوں نے اس کا راستہ روک لیا اور سائیکل سے اتار کر اتنا زدو کوب کیا کہ غریب کو جان کے لالے پڑ گئے۔

پہلے مقابلے میں بہت کم لوگوں نے شرکت کی تھی۔ جو چند امیدوار آ بھی گئے تھے، اُن میں سے پہلے چار کو انتخاب کرنے والی کمیٹی بعض بے ضابطگیوں کی بنا پر یکے بعد دیگرے جب نا اہل قرار دیتی گئی، تو ایڈیٹر کے آنسو نکل آئے۔ وہ کہنے لگا کہ انتخاب کی اگر یہی صورت رہی، تو یہ ٹور کبھی عمل میں نہیں آئے گا، لیکن ٹور عمل میں آیا اور اس وقت سے آج تک برابر ہر سال منعقد ہوتا ہے۔ یہاں تک کہ پہلی اور دوسری جنگ عظیم کے شعلے بھی اسے نہ روک سکے۔ تیسری اور چوتھی فرینچ ری پبلکن بھی اسکی نہ راہ میں حائل نہ ہو سکیں۔

کئی اعتبار سے ٹور کو جنگ سے تشبیہ دینا نامناسب نہ ہوگا۔ جنگ کی طرح اس کے مسائل بھی بڑے منطقیانہ اور پیچیدہ ہوتے ہیں۔ سب سے پہلے راستہ متعیّن کرنے کا سوال سامنے آتا ہے۔ یہ اتنا آسان نہیں جتنا بظاہر نظر آتا ہے۔ اس کا فیصلہ ہو جانے کے بعد دوسرا سوال ان شہروں کا آتا ہے جو ٹیم کو اپنے یہاں ٹھہرانا چاہتے ہیں۔ یہ بات درخواست کرنے والے شہروں کے لئے کچھ آسان نہیں ہوتی۔ منتخب ہو جانے پر ہر شہر کو دس ہزار ڈالر شکرانے کے طور پر ادا کرنا پڑتا ہے۔ اس کے لئے یہ بھی لازم ہوتا ہے کہ اپنے یہاں ایک ہزار بستروں کا انتظام کرے اور کمیٹی کو یقین دلائے کہ اسے میونسپل کمیٹی کا کامل تعاون حاصل ہے۔

ہر سال ٹور کا راستہ بدلتا رہتا ہے جس کے کئی اسباب ہیں۔ ایک تو یہی کہ ٹور کی بین الملکی حیثیت برقرار رہے، دوسرے ان نئے نئے شہروں کی خواہش کا احترام کرنا پڑتا ہے جو چاہتے ہیں کہ مقابلہ کرنے والے اس مرتبہ ہمارے یہاں سے گزریں۔ تیسرے ان شہروں کو سزا دینا بھی مقصود ہوتا ہے جنہوں نے پچھلے سال ٹور کے شایان شان انتظام نہیں کیا تھا۔

مقابلہ جون میں شروع ہوتا ہے، مگر فروری ہی سے اس کے معاملات پر غور و خوض کی ابتدا ہو جاتی ہے۔ ایک ایک شق کو زیر بحث لا کر اس کے متعلق آخری بات طے ہوتی ہے، مثلاً: یہ ٹیم کن مقامات سے گزرے گی؟ راستے میں کتنے پُل اور موڑ آئیں گے؟ ہر مقام سے گزرنے کا وقت اندازاً کیا ہوگا؟ وہاں کن انتظامات کی ضرورت ہوگی؟ حتیٰ کہ کتنی ٹولیاں درکار ہوں گی؟ تماشائیوں کی تعداد کیا ہوگی۔ ان کی روک

تھام کے لئے کتنی پولیس طلب کرنا پڑے گی؟ شہروں میں قیام کی صورت میں اس لشکر کی ضروریات کیا ہوں گی؟ ان شہروں میں کھانے پینے کی کون کون سی اشیاء مل سکیں گی؟ کن چیزوں کو دوسری جگہ سے مہیا کرنا ہوگا؟ پانی اور بجلی کے لئے کیا کرنا پڑے گا؟ خبریں اخبارات کو بھیجنے کے لئے کن مقامات پر ٹیلی فون کیبن قائم کئے جائیں گے؟ یہ تو موٹی موٹی باتوں کا ایک سرسری ذکر ہے، ورنہ انتظامات کی فہرست بہت طویل ہوتی ہے۔ اگر ایک بات بھی نظر انداز ہو جائے تو عین موقعے پر بڑی خرابی کا امکان ہو سکتا ہے۔

ٹور پر ہر سال کم و بیش پانچ لاکھ ڈالر خرچ ہوتے ہیں۔ اس کا ایک حصہ ٹور سے دلچسپی رکھنے والا تجارتی حلقہ ادا کرتا ہے۔ ایک حصہ ٹیم کو اپنے یہاں ٹھہرانے والے شہروں سے رقم تنکرانے کے علاوہ فیس کے ذریعہ وصول کیا جاتا ہے۔ اس کے بعد جو کمی رہ جاتی ہے اُسے وہ اخبار ادا کرتا ہے۔ جو اس ٹور کا سبب ہوا تھا۔

ٹور پر روانہ ہونے سے قبل پارٹی کو ایک منظم فوج کی طرح ترتیب دیا جاتا ہے۔ مقابلہ کرنے والوں کو بارہ بارہ کی ٹولیوں میں تقسیم کیا جاتا ہے۔ ہر ٹولی کے ساتھ تین کاریں، ایک ٹرک، ایک کوچ گاڑی، تین سائیکل استاد اور تین مکینک ہوتے ہیں۔ سائیکل سواروں کی عورتوں کو ساتھ رکھنے کا کوئی انتظام نہیں ہوتا۔ وہ اپنے شوہروں کی نقل و حرکت ٹیلی وژن میں دیکھ سکتی ہیں۔

اوسطاً ہر مقابلہ کرنے والے کو روزانہ ایک لمحہ ٹھہرے بغیر چھ گھنٹے سائیکل چلانا پڑتی ہے۔ سائیکل چلانے کے دوران میں وہ پھل اور کھانے کی دوسری چیزیں اپنے پشت کے تھیلوں سے نکال نکال کر کھاتے رہتے ہیں۔

سائیکل کی رفتار ہموار سطح پر پچیس میل اور پہاڑی ڈھلوانوں پر ساٹھ میل فی گھنٹہ ہوتی ہے۔ سائیکلیں ایلومینیم کی بنی ہوتی ہیں۔ ہر ایک کا وزن پانچ پونڈ ہوتا ہے۔ ٹائر کی چوڑائی انسانی ہاتھ کے انگوٹھے کی چوڑائی کے برابر ہوتی ہے۔ سائیکل دوڑاتے وقت زمین کا ذرا سا شگاف، تھوڑی سی ریت یا تیل کا بیچ میں آجانا یا زیادہ جھکنے سے مڑنا بعض وقت الم ناک سانحہ بن جاتا ہے۔

اس وقت تک مہلک حادثے بہت کم ہوئے ہیں۔ اس کا سبب شاید یہ ہے کہ سائیکل سوار بہت تھکے ہوتے ہیں، اس لئے خطرے کا اندازہ ہوتے ہی بجائے اس کے کہ مقابلہ کریں، سائیکل سے نیچے پھسل پڑتے ہیں

ٹور ختم ہوتے ہوتے اکثر مقابلہ کرنے والے سخت جسمانی تکلیفوں میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ شدید تھکن کی شکایت تو عام ہوتی ہی ہے، اس کے علاوہ بعضوں کو پیچش ہو جاتی ہے۔ بعضوں کی بیٹھک کے مقام پر ڈھٹے پڑ جاتے ہیں جو آزار دہ چھالوں اور بعض اوقات سرطان کی شکل اختیار کر لیتے ہیں۔ اس کی وجہ ایک یہ بھی ہے کہ سائیکلوں کی سیٹ تنگ اور بہت سخت ہوتی ہے، کئی برس پہلے تک سیٹ نرم

مخملیں گدی کی مانند ہوتی تھی، مگر اب یہ رواج اُٹھا دیا گیا ہے۔
ٹیم کے ساتھ کئی ڈسپنسریاں ہوتی ہیں، جن میں پنسلین اور طرح طرح کی دوائیں موجود رہتی ہیں۔ مقابلہ کرنے والے ان دواؤں کو اپنے خستہ جسم کی تھکن مٹانے یا پھیپھڑوں کو ہلکان کر دینے والی چڑھائی شروع ہونے وقت پیتے رہتے ہیں۔ ان کی زیادہ مقدار حادثے کا باعث ہوسکتی ہے، لہٰذا تقسیم کرنے والے اس بارے میں بڑی احتیاط برتتے ہیں۔

ٹور کی تاریخ افسوس ناک واقعات سے داغدار ہے۔ ۱۹۱۴ء میں پال نامی ایک سائیکل سوار سب سے آگے نکل رہا تھا۔ ایک دن صبح کے وقت وہ سائیکل پر روانہ ہوا۔ جب وہ پچیس میل فی گھنٹہ کی رفتار سے جا رہا تھا، یکایک سائیکل کے دو ٹکڑے ہوگئے اور پال ایک گہری کھائی میں جا پڑا۔ دیکھنے پر پتہ چلا کہ کسی نے سیٹ اور ہینڈل کے درمیان والے ڈنڈے کو کاٹ دیا ہے۔ یہ کام بلیڈ وغیرہ سے اس عیاری کے ساتھ کیا گیا تھا کہ کاٹنے کا خط ذرا نظر نہیں آتا تھا۔ اس وقت سے ہر سائیکل سوار روزانہ روانہ ہونے سے پہلے اپنی سائیکل کی اچھی طرح پڑتال کر لیتا ہے۔

۱۹۵۰ء میں ایک اطالوی ٹیم سب سے آگے ہوگئی تھی۔ جب وہ بورڈے کے مقام پر پہنچی تو اسے طعن آمیز نعرے لگانے والے فرانسیسیوں سے سابقہ پڑا۔ آگے چل کر جب ٹیم کوہ پینیز کو پار کر رہی تھی، اس وقت تماشائیوں نے اس پر سڑے ہوئے آلوؤں اور ٹماٹروں کی بوچھار کر دی اور ایک شخص نے ٹیم کے کپتان کو دھکا دے کر سائیکل سے گرا دیا۔ یہی کپتان جب ایک پہاڑی چٹان پر سے گزر رہا تھا، تو ایک کار نے ٹکر مار کر اسے چٹان سے نیچے پھینک دیا۔ ان ناگوار واقعات سے مشتعل ہو کر اطالیوں نے اس ٹور سے کنارہ کشی اختیار کر لی۔ دوسرے سال اس اندیشے سے کہ کہیں اہل اطالیہ فرانسیسی سائیکل سواروں سے بدلہ نہ لیں۔ اطالیہ کو بڑی حکمت عملی کے ساتھ ٹور کے راستے سے علیحدہ رکھا گیا۔

ان واقعات سے اب بھی نجات نہیں ہے۔ ۱۹۵۸ء میں ایک جرمن سائیکل سوار گال کو روانگی کے ذرا ہی دیر بعد معلوم ہوا کہ سائیکل ڈگمگا رہی ہے۔ اُتر کر دیکھا، تو سائیکل کے سارے پیچ ڈھیلے کر دیئے گئے تھے۔

اس ٹور نے اتنی اہمیت حاصل کر لی ہے کہ جیتنے والے افراد غیر معمولی شہرت و عزت کے مالک بن جاتے ہیں۔ پچھلے سال گال نے پانچ ہزار سٹرلنگ کا انعام حاصل کیا جو اس کے نقصانات کا صرف ایک حصہ تھا، لیکن انعام کے جیتنے سے وہ اتنا مشہور ہوگیا کہ کارخانوں کے مالک اپنی مصنوعات پر اس سے تائیدی بیان حاصل کرنے کے لیے ایک سے ایک بڑھ چڑھ کر رقم پیش کرتے ہیں۔

آج کل دوسرے ورزشی کھیلوں کی نامور ہستیوں کی طرح سائیکل دوڑانے کے مشاق بھی عام مقبولیت اور دولت کا مرکز بن گئے ہیں۔ ایک معمولی نانبائی نے "تور دی فرانس" کو تین مرتبہ جیتا۔

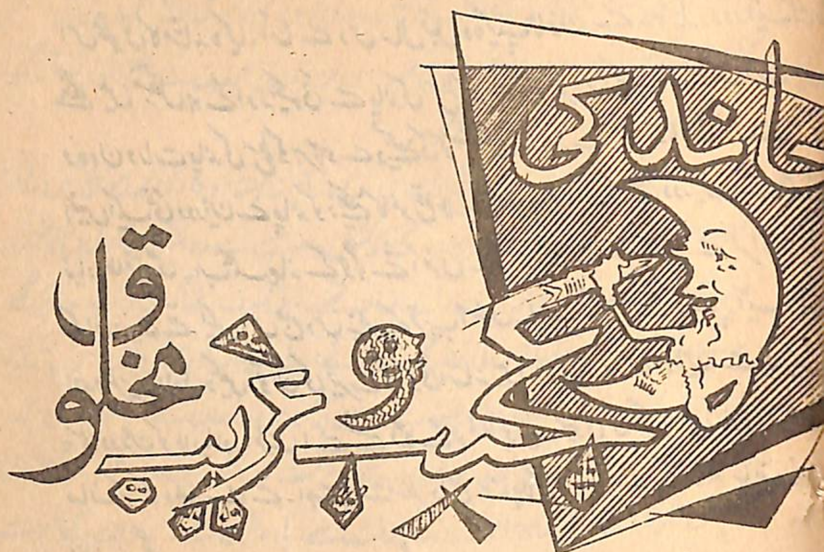
اب اس کا شمار فرانسیسی معیار زندگی کے اعتبار سے آسودہ حال لوگوں میں ہوتا ہے۔ اس کا اپنا ذاتی ہوائی جہاز ہے۔ وہ عیش و آرام کے سامانوں سے آراستہ ایک خوبصورت اور شاندار عمارت میں رہتا ہے اور کئی نفع بخش کاروبار کر رہا ہے۔

قریب قریب یہی حالت دوسرے مقابلہ جیتنے والوں کا ہے۔

"ٹور دی فرانس"، جو مسلسل ساٹھ برس سے اس پابندی اور شان کے ساتھ جاری ہے، ہر سال نوجوانوں کے سامنے عزم و استقلال اور مردانہ جرأت و ہمت کے نمونے پیش کر کے ان سے انہی اوصاف کے مظاہروں کا تقاضہ کرتا ہے۔







"چاند پر انسانی آبادی موجود ہے" اس بات کا انکشاف مشہور سائنس داں ڈاکٹر اینڈریو گرانٹ نے کیا ہے جو ایک مدت سے کیپ ٹاؤن میں طاقتور خوردبین کی مدد سے چاند کی سطح کا مشاہدہ کر رہے ہیں۔ ڈاکٹر اینڈریو کے اس بیان نے دنیا کے ہر خطے میں بسنے والے باشندوں میں سنسنی پھیلادی ہے۔ آج تک سائنس داں یہی کہتے چلے آئے ہیں کہ چاند پر انسان تو کیا کسی دوسرے جاندار کا نام و نشان بھی نہیں ملتا۔ یہ بھی اندازہ لگایا گیا تھا کہ چاند پر کشش ثقل نہ ہونے کی وجہ سے کوئی جاندار چل پھر نہیں سکتا۔ پھر وہاں کا درجۂ حرارت اس قدر کم ہے کہ انسان کے لئے سانس لینا بھی ناممکن ہے، لیکن اعتراض کرنے والوں نے غالباً یہ نہیں سوچا کہ ہماری دنیا پر بھی بعض ایسے علاقے موجود ہیں جہاں انتہائی سخت سردی پڑتی ہے اور وہاں کے جانور شدید سردی کے باوجود زندہ رہتے ہیں، البتہ انہی جانوروں کو شدید گرم علاقے میں لے جایا جائے تو وہ تھوڑے ہی عرصے میں مر جاتے ہیں۔ اگر چاند پر بہت زیادہ سردی ہے، تو وہاں کی مخلوق یقیناً اس سردی کو برداشت کرنے کی قوت رکھتی ہے۔

ان خیالات کا اظہار ڈاکٹر صاحب نے اپنے تازہ ترین مقالے میں کیا ہے۔ اس

مقالے کا دلچسپ ترین حصہ وہ ہے جس میں ڈاکٹر صاحب نے یہ بتایا ہے کہ انھوں نے کس طرح اس مخلوق کا مشاہدہ کیا۔ آج سے دس سال قبل وہ کیپ ٹاؤن سے ۵۰ میل دور ایک کشادہ بنگلے میں منتقل ہوئے اور یکسوئی سے چاند کی سطح کا مشاہدہ شروع کیا۔ اس طویل مدّت میں وہ دن و رات چاند کی سطح کو ہر پہلو سے دیکھنے کی کوشش کرتے رہے۔ گزشتہ ماہ کی دس تاریخ کو انھیں ایک نئی دوربین سے چاند کو دیکھنے کا موقع ملا۔ یہ نئی دوربین ان کی پہلی دوربینوں سے دس گنا زیادہ طاقتور تھی۔ اب تک چاند کے جو گوشے اُنھوں نے دیکھے تھے، وہ دور سے بنجر اور ویران دکھائی دیتے تھے۔ لیکن اس صبح دس بجے کے قریب اُنھوں نے چاند کے مشرقی کونے پر ایک خوبصورت اور دلفریب وادی دیکھی، تو ان کی حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی۔ انھوں نے اس دوربین سے اپنی ایک پہلی دوربین کو ملا دیا اور آخر میں ایسے شیشے لگائے جو منظر کو ایک چھوٹی سی سکرین پر زیادہ واضح اور صاف کرکے دکھا رہے تھے۔ آہستہ آہستہ منظر واضح ہوتا چلا گیا اور سبزے کے ساتھ ساتھ درخت بھی نظر آنے لگے۔

یہ درخت اُونچے اُونچے تھے اور ہمارے یہاں کے پہاڑی درختوں سے مشابہ تھے۔ پس منظر میں بلند و بالا پہاڑ نظر آ رہے تھے۔ جن کی ڈھلانوں پر زرد رنگ کے چھوٹے چھوٹے پودے اُگے تھے منظر اس قدر خوبصورت تھا کہ ڈاکٹر خوشی سے چلّا اُٹھا۔

چھوٹی چھوٹی سفید چٹانیں چیرتی ہوئی ایک ندی پہاڑوں سے نکل کر وادی کو سیراب کرتی ہوئی گزر رہی تھی، پانی کا رنگ گہرا نیلا تھا۔ سب سے پہلے زندگی کے جو نشان ملے، وہ پہاڑی بکریاں تھیں۔ زرد گھاس چرتے ہوئے یہ جانور ہمارے یہاں کی پہاڑی بکریوں سے خاصے مشابہ تھے۔ ایک خاص بات جو انھیں ہمارے جانوروں سے ممتاز کر رہی تھی، وہ ان کے جسموں سے نکلتی ہوئی روشنی کی کرنیں تھیں۔ روشنی کی ان کرنوں کا رنگ ہلکا سبز تھا۔ بکریوں کے علاوہ گینڈے سے ملتے جلتے جانور بھی تھے جن کے ماتھے سے نکلتے ہوئے سینگ سبز روشنی دے رہے تھے۔ ان کے کان ہاتھی کی طرح تھے اور چلتے وقت زور سے ہلتے تھے۔ ان کی دُمیں سانپ کی طرح بل کھائی ہوئی تھیں۔ زیبرے کی طرح کے جانور بھی دکھائی دیئے۔ بعض جانور گھاس کے تختوں پر لوٹ رہے تھے، دیکھنے میں وہ بھیڑوں کی طرح تھے، لیکن ان کی ٹانگیں نہیں تھیں۔ چند سارس بھی دکھائی دیے جو قد و قامت میں ہاتھی سے بھی بڑے تھے اور ندی کے کنارے اِدھر اُدھر پھر رہے تھے۔

سانپ کی طرح ان کی زبانیں باہر نکلی ہوئی تھیں۔ درختوں پر پرندے بیٹھے ہوئے تھے۔ ان کے پر گہرے سرخ تھے اور چونچیں نیلے رنگ کی تھیں۔ ندی جو وادی کو چیرتی ہوئی گزر رہی تھی، خشکی کو کئی چھوٹے چھوٹے جزیروں میں تقسیم کر رہی تھی۔ ان جزیروں پر مچھلیوں سے ملتی جلتی مخلوق گھوم رہی تھی چاروں طرف سرخی پھیلی ہوئی تھی۔

اچانک چٹانوں سے چار چمگادڑیں سی اُتریں۔ آہستہ آہستہ وہ وادی میں پہونچ گئیں۔ ڈاکٹر انڈریو اور اس کے ساتھی یہ دیکھ کر حیران رہ گئے کہ شکل و صورت سے وہ انسان دکھائی دیتی تھیں۔ غور سے دیکھنے پر پتہ چلا کہ یہ چاند پر بسنے والے انسان تھے۔ فرق صرف یہ تھا کہ ان کی کمروں پر پَر لگے ہوئے تھے۔ ڈاکٹر نے فوراً اس کی توجیہہ کرتے ہوئے اپنے ساتھیوں کو بتایا کہ چاند پر کششِ ثقل نہیں ہے، اس لئے انسان کے لئے پیدل چلنے سے ہوا میں اُڑنا زیادہ آسان ہے۔ یہ منظر اس قدر دلچسپ تھا کہ کسی کو اس کی بات پر توجہ دینے کی فرصت نہیں تھی، چاروں "انسان" ندی کے پاس آکر گھاس پر اُترے، ان کے قد چار فٹ سے زیادہ نہیں تھے۔ البتہ ان کے جسم بہت مضبوط تھے۔ شروع میں یوں محسوس ہوا جیسے انھوں نے سفید رنگ کے کپڑے پہنے تھے، لیکن بعد میں غور کرنے سے پتہ چلا کہ ان کے جسموں پر سفید بال ہیں۔ دیکھتے ہی دیکھتے وہ ندی میں گھس گئے اور بطخوں کی طرح پانی پہ تیرنے لگے۔ تھوڑی دیر بعد وہ باہر نکلنے اور پر ہلا ہلا کر جسم خشک کرنے لگے وہ آپس میں ہنس ہنس کر باتیں کرتے ہوئے دکھائی دے رہے تھے۔ کیونکہ ان کے لب ہل رہے تھے۔ ان کی ٹانگیں بگلوں کی طرح دبلی اور کمزور تھیں۔ عجیب بات یہ ہے کہ وہ گھروں کی بجائے گھونسلوں میں رہتے تھے جو اونچے اونچے درختوں کی شاخوں سے لٹک رہے تھے۔ ان چمگادڑ نما انسانوں میں عورتیں بھی تھیں اور مرد بھی۔ آپس میں ان کا برتاؤ دیکھ کر یہ اندازہ ہوتا تھا کہ وہ بہت خوش ہیں اور ایک دوسرے سے نہایت اچھا سلوک کرتے ہیں۔ وہ قریبی درختوں سے عجیب و غریب پھل توڑتے اور ایک دوسرے کی طرف پھینک دیتے۔ چند ایک پھول توڑ رہے تھے۔ چاند کا جو حصہ دوربین کی زد میں تھا۔ اس میں کوئی موٹر، گاڑی یا راکٹ دکھائی نہیں دیا۔ جس سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ وہاں تہذیب و تمدن نے اس قدر ترقی نہیں کی جتنی ہمارے یہاں ہوئی ہے۔"

۸ ستمبر ۱۸۳۵ء کو نیویارک میں ایک تباہ حال نوجوان مختلف اخباروں کے چکر لگا

رہا تھا۔ صبح سے شام تک گھومنے کے باوجود اسے کہیں ملازمت نہ مل سکی۔ اس نوجوان کا نام "رچرڈ آدم" تھا۔ وہ انگلستان میں پیدا ہوا، کیمبرج یونیورسٹی سے تعلیم مکمل کی۔ تلاش روزگار میں وہ نیویارک چلا آیا۔ وہ صحافی بننا چاہتا تھا، لیکن اجنبی شہر میں واقفیت کے بغیر کسی اخبار میں اسے جگہ نہ مل سکی۔ شام کے وقت تھکا ہارا وہ ایک سڑک پر دُکان کے سامنے بڑھے ہوئے تختے پر بیٹھ گیا اور اپنی بدقسمتی پر غور کرنے لگا۔ سامنے کچھ شور سُنائی دیا۔ اس نے آنکھ اٹھا کر دیکھا تو چند مزدور ایک بورڈ اتارنے کی کوشش کر رہے تھے جس پر "دی ڈیلی سن" لکھا تھا۔ اس نے پاس جاکر پوچھا تو معلوم ہوا کہ یہ ایک روزنامے کا دفتر تھا، لیکن اس کی اشاعت اس قدر گر گئی تھی کہ مالک نے اسے بند کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ وہ فوراً اندر گیا اور مالک سے ملنے کی کوشش کی، لیکن وہ بہت مصروف تھا۔ ایک گھنٹے تک وہ باہر بنچ پر بیٹھا رہا۔ مالک باہر نکلا، تو اس نے اپنا تعارف کرایا اور اسے پیشکش کی کہ اگر وہ صرف تین دن کے لئے اپنا فیصلہ ملتوی کر دے، تو وہ اخبار میں دوبارہ جان ڈال سکتا ہے اور اس کی اشاعت میں ہزار تک پہنچا سکتا ہے۔ اخبار کے مالک مسٹر جان تھامپسن نے حیرت سے اس مفلوک الحال نوجوان کی طرف دیکھا جو انتہائی اعتماد سے اتنا بڑا دعویٰ کر رہا تھا، آزما لینے میں حرج ہی کیا تھا۔ اس نے اجازت دیدی۔

اگلی صبح نیویارک کے گلی کوچوں میں اس مضمون کے اشتہار چسپاں تھے "چاند پر انسانی مخلوق آباد ہے، مشہور ماہر فلکیات ڈاکٹر انڈریو کا انکشاف، چاند پر بسنے والے انسان پرندوں کی طرح اڑتے ہیں۔ ڈاکٹر انڈریو کا مفصل بیان آج کے تازہ "ڈیلی سن" میں دیکھئے"

رچرڈ آدم کی ترکیب کامیاب ثابت ہوئی اور ڈاکٹر "انڈریو" کے نام سے لکھا ہوا اس کا مضمون پڑھنے کے لیئے بے شمار لوگوں نے "ڈیلی سن" کا پرچہ خریدا۔ مضمون کے آخر میں لکھا تھا "باقی کل کے اخبار میں دیکھئے"

پہلے روز پانچ ہزار پرچے فروخت ہوئے۔ اخبار کے مالک نے ڈرتے ڈرتے صرف تین ہزار پرچے شائع کئے تھے، لیکن بڑھتی ہوئی مانگ کو پورا کرنے کے لئے اسے دو ہزار مزید کاپیاں چھپوانا پڑیں۔ رات کے ایک بجے تک لوگ اخبار کے دفتر کے چکر لگاتے رہے۔ تین دن تک مضمون شائع ہوتا رہا اور اخبار کی اشاعت پچیس ہزار تک جا پہنچی۔ آخری قسط کے بالکل آخر میں لکھا تھا: "یہ ساری روداد فرضی ہے"

●●


KARKHANA DARUSSEHAT
K
DS


REGISTERED
QUDRATI
TEL
قدرتی تیل
INDICATIONS
PAIN IN JOINTS AND
MUSCLES, SPRAIN,
SWELLING, CUTS & BURNS
TRADE MARK
ESTD 1903
DARUSSEHAT (REGD.)
MAUNATH BHANJAN, U.P.

OCTOBER
FASANA (URDU MONTHLY) VOL. I—VI
ALLAHABAD. Price 75 p. Regd. No. L—420
Registered with the Rgistrar of Newspapers for India at No. 9775/64

